حضرت مولانا سید

مناظر احسن گیلانیؒ

سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

یونائٹیڈ ویلیفر ایسوسی ایشن استھانواں نالندہ

(۱۴۳۶ھ مطابق ۲۰۱۵ء)
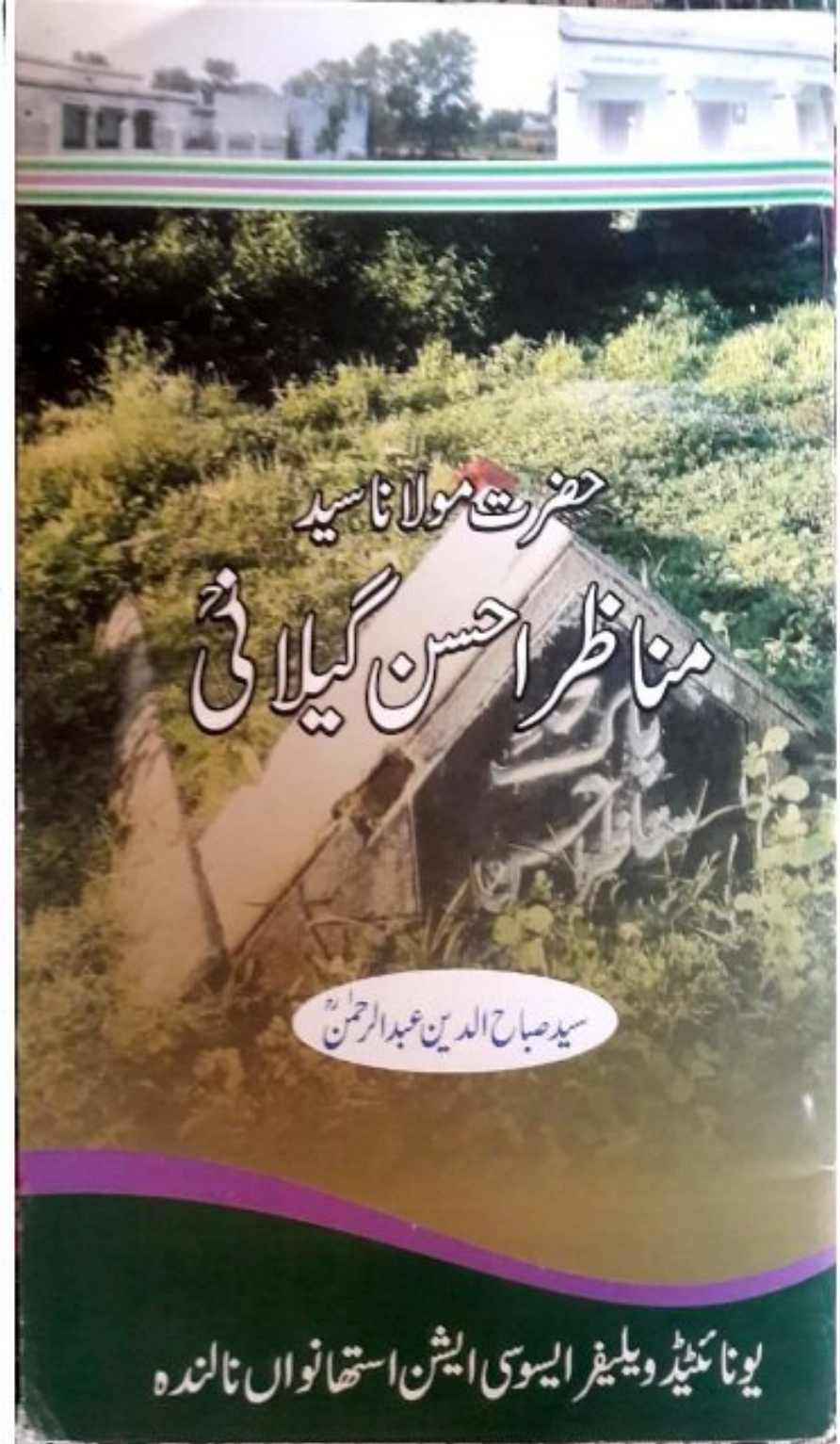
باراول

۱۴۳۶ھ - ۲۰۱۵ء

نام کتاب	:	حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
نام مصنف	:	سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ
صفحات	:	۴۸
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
ناشر	:	انجمن الفلاح استھانواں نالندہ
باہتمام	:	یونائیٹیڈ ویلفیئر ایسوسی ایشن، استھانواں، نالندہ
طباعت	:	نیو ورک لائن پریس، لکھنؤ

طابع وناشر

یونائیٹڈ ویلفیر ایسوسی ایشن

استھانواں، نالندہ

(۱۴۳۶ھ مطابق ۲۰۱۵ء)

عرض حال

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت پر بہت سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے، اور مولانا موصوف کی مختلف الجہات شخصیت پر روشنی ڈالی ہے، اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، ہندوستان و پاکستان میں ابھی قریب میں بہت سی کتابیں سامنے آئی ہیں، لیکن اب بھی مزید ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

زیر نظر کتابچہ حضرت مولانا کے ایک نامور عزیز و ہم وطن جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دسنوی ایم اے ناظم دارالمصنفین کے قلم سے ہے، یہ درحقیقت ایک مضمون ہے جو ان کی وفات کے بعد تحریر کیا گیا تھا، اور معارف میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا، اور اہل علم کے حلقہ میں پسند کیا گیا تھا، پھر ان کی "بزم رفتگاں" میں جو ان کی خاکہ نگاری کا شاہکار ہے شائع ہوا۔

حضرت صاحب سوانح کو ان سے قربت بھی تھی اور دارالمصنفین کے صدر کی حیثیت سے ان کو قریب سے دیکھنے کا مزید موقع ملا تھا، اس لئے انہوں نے مولانا سے خود اپنے تعلقات، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے مراسم نیز وطن کے متعلق متعدد واقعات پر روشنی ڈالی ہے، خود اس بستی استھانواں (جو مولانا کی نانیہال بھی ہے) کے بھی بعض واقعات اس میں درج ہیں۔

اس لئے خیال آیا کہ اہل وطن اور اطراف کے لوگوں کے لئے بالخصوص اور پورے ملک کے افادہ کے لئے بالعموم الگ سے اس کی اشاعت کی جائے، چنانچہ استھانواں کے نوجوانوں کی ثقافتی تنظیم یونائیٹیڈ ویلفیر ایسوسی ایشن اسے شائع کر رہی ہے، امید ہے کہ قارئین اس سے مستفید ہوں گے۔

محمد ضیاء الحق شرفی

صدر یونائیٹیڈ ویلفیر ایسوسی ایشن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں گیلانی کے رہنے والے تھے، یہ گاؤں راقم کے وطن دیسنہ سے دوکوس کے فاصلہ پر ہے اور ضلع پٹنہ کی مشرقی سرحد کا آخری گاؤں ہے، اس کے بعد مونگیر کی سرحد شروع ہوجاتی ہے، اس کا ڈاک خانہ بربگہہ ہے، جو گیلانی سے ایک میل پر مونگیر میں ہے، اس لیے مولانا مرحوم سے خط وکتابت کرنے والے ان کو مونگیر کے ضلع کا باشندہ سمجھتے تھے، لیکن وہ دراصل پٹنہ ضلع ہی کے رہنے والے تھے۔

یہ سطور لکھتے وقت ۱۹۲۰ء کا زمانہ یاد آرہا ہے، جبکہ راقم کے وطن دیسنہ کی آب وہوا وبائی امراض کی وجہ سے خراب ہوگئی تھی، اس لیے گھر کے تمام لوگ گیلانی منتقل ہوگئے تھے، جہاں ہمارے بعض خاص اعزہ بھی رہتے تھے، ہم جس عزیز کے گھر میں مقیم تھے، اسی کے سامنے ایک بڑا مکان تھا، جس سے مکینوں کی خوشحالی اور فارغ البالی کا اندازہ ہوتا تھا، راقم اس زمانہ میں سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا، لیکن کانوں میں یہ آواز پڑی کہ یہ مکان مولانا مناظر احسن صاحب کا ہے اور گھر میں ان کے متعلق احترام وعقیدت کی جو باتیں سنیں ان سے یہ اندازہ ہوا کہ کوئی بڑے اچھے مولانا صاحب ہیں، اور شوق پیدا ہوا کہ کاش ان کو دیکھتا۔

غالباً ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا، ترکِ موالات کی تحریک زور پر تھی، اس وقت راقم اس

تحریک کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن گھر کے بعض بزرگوں کو مولانا مناظر احسن کی ایک نظم پڑھتے سنا، جس کے معنوی تو نہیں لیکن صوتی اثرات دل پر ایسے قائم ہوئے کہ مولانا کی ذاتِ گرامی سے دلچسپی کچھ اور بڑھی، گھر میں ان کا ذکر برابر ہوتا رہتا تھا، وہ اس وقت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں لکچرار ہوچکے تھے، اور ان کی علمی قابلیت واستعداد کے چرچے سے کان آشنا ہونے لگے تھے، گھر میں اعزہ ان سے زیادہ ان کے دادا، چچا اور والد کے فضائل کا ذکر کرتے، جنہیں سن کر دل میں یہ اثر ہوا کہ مولانا ایک بڑے اہلِ علم خاندان کے فرزند ہیں، ان کے دادا مولانا سید محمد احسن اپنے زمانہ کے جید عالم تھے، یہ معلوم کرکے اور تعجب ہوا کہ انہوں نے شادی اور صاحب اولاد ہونے کے بعد تعلیم شروع کی تھی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب ان کی پہلی اولاد ہوئی تو کسی نے ان کے ان پڑھ ہونے پر طنز کیا، اس کا ان کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ وہ چپکے سے تعلیم کے لئے گیلانی سے نکل کھڑے ہوئے، اور بنارس، لکھنؤ اور رام پور میں تعلیم حاصل کرکے چودہ سال کے بعد وطن لوٹے، اور جب ان کے علم کی شہرت پھیلی تو نہ صرف اطراف وجوانب بلکہ مختلف صوبوں سے طلبہ آکر ان سے فیض حاصل کرنے لگے، ان کے شاگردوں میں ملا عبداللہ ہزارہ صوبہ سرحد کے تھے، وہ مولانا کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ گیلانی ہی میں متوطن ہوگئے، ملا عبداللہ کے زہدوتورع کے قصے اطراف وجوانب میں اب بھی شوق سے کہے اور سنے جاتے، مولانا احسن کے شاگردوں میں مولوی محمد رفیع صاحب (شکرانوں، ضلع پٹنہ مولوی عبدالغفور صاحب (کوننڈ ضلع پٹنہ) اور مولوی محمد اسماعیل صاحب (رمضان پور ضلع پٹنہ) بھی تھے، یہ تینوں اپنے

اطراف کے بڑے رئیس بھی تھے۔

مولانا احسن کے دو صاحبزادے، مولانا حاجی ابونصر، اور مولانا حافظ ابوالخیر، جو مولانا مناظر احسن کے والد تھے، مولانا ابونصر اپنے علم وفضل اور شعر وشاعری کے ذوق کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، انہوں نے بھی رام پور اور لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی، مولانا مناظر احسنؒ نے ان ہی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، ان کے والد حافظ ابوالخیر صاحب زیادہ تر زمینداری اور کاشتکاری کے کاموں میں لگے رہے، ان کو آموں کے باغ لگانے کا بڑا شوق تھا اور ان کے باغ کے آم دور دور تک مشہور تھے، بڑے مخیرّ اور فیاض تھے، ان کی سخاوت وفیاضی کے واقعات سن کر دل پر یہ اثر تھا کہ مولانا مناظر احسن ایسے گھر کے چشم وچراغ ہیں، جہاں علم وفضل کے علاوہ خوشحالی اور فارغ البالی بھی ہے، اس لیے ان کی زیارت کی خواہش دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔

دسمبر ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں دیسنہ میں ایک تقریب تھی جس میں شرکت کے لیے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی اعظم گڑھ سے وطن تشریف لائے تھے، ایک رات وہ صاحبِ تقریب کے گھر میں بیٹھے تھے کہ معلوم ہوا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی سے تشریف لائے ہیں، اور حضرت سید صاحب سے ملنے کے لیے آرہے ہیں، دل میں ان کی زیارت کا اشتیاق عرصہ سے تھا، اس لیے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی، اور تھوڑی دیر میں میانہ قد، گندمی رنگ کا ایک خوش وضع، اور دل کش انسان میری نگاہ کے سامنے تھا، اور دل نے محسوس کیا کہ اس دلکش جسم میں ایک لطیف روح بھی ہے، ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور

چہرہ پر بزرگی اور تمکنت کے آثار نظر آئے، حضرت سید صاحبؒ نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا، اور جب دونوں میں باتیں شروع ہوئیں تو مجلس کے اور شرکاء خاموشی سے سننے لگے، میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے اپنی جنت آرزو کی سیر کرنے لگا، دونوں بزرگ مختلف علمی، مذہبی اور سیاسی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے، جس کو میں اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن اس صحبت کی لذت آج تک یاد ہے، اور جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایک برج میں دو قمر کو دیکھ رہا تھا، اس مجلس میں ان بزرگوں کا جو احترام ہو رہا تھا، اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اہلِ علم ہونا کتنی قابلِ قدر چیز ہے اور معاً یہ خواہش بھی ہوئی کہ کاش میں بھی ان بزرگوں کی خاک پا ہوتا۔

اس ملاقات کے ایک طویل عرصہ کے بعد جب میں اسکول کی تعلیم ختم کرکے کالج میں پڑھ رہا تھا، ایک دن خبر ملی کہ مولانا حیدرآباد سے آئے ہیں اور علاج کیلئے پٹنہ کے اسپتال میں داخل ہیں، اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ کو اپنی طرف کھینچ کر اسپتال بلا رہے ہیں، گو اب تک میرا تعارف ان سے نہیں ہوا تھا، لیکن میں ان کی زیارت کے لئے اسپتال پہنچ گیا، ان کی عیادت کے لیے اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے، میں ان کے کمرہ میں جا کر ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا، اور ان کو دیکھتا رہا، ان کا کوئی آپریشن ہوا تھا، جس کی تکلیف سے نڈھال تھے، لیکن مجھ کو ان کے شرف دیدار سے بڑی تسکین ہوئی، مگر ان سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ کر سکا، اور تھوڑی دیر ٹھہر کر خاموشی سے باہر چلا آیا، اس طرح کئی دن برابر اسپتال گیا اور صرف ان کو دیکھ کر لوٹ آتا، اور اسی میں اپنی سعادت سمجھتا رہا، اور ان کے

لیے دل سے دعائیں نکلتی رہیں، اور جب وہ شفایاب ہوکر اسپتال سے چلے گئے تو مجھ کو بھی بڑی مسرت ہوئی۔

طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک روز سننے میں آیا کہ مولانا نے اپنے نانہال استھانواں میں ایک پرزور تقریر کی ہے، اور اس میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے محض معاصرانہ چشمک کی بنا پر ان کی بعض تصانیف پر اعتراضات اور ان کے بعض اشعار پر نکتہ چینی کی ہے، مگر میرا دل اس کو قبول کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھا، لیکن کچھ لوگ اس واقعہ کو ہوا دیتے رہے، اور اس کی خبر حضرت سید صاحب تک بھی پہنچائی، اور اس کا ذکر نجی صحبتوں میں بھی برابر جاری رہا، اتفاق سے اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں مولانا کا ایک مضمون ''حضرت حکیم مولانا سید برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ'' کے عنوان سے معارف میں چھپا، اور اس کو حضرت سید صاحب نے سر مقالہ شائع کیا، اس کو دیکھ کر معاً یہ خیال آیا کہ دونوں بزرگوں کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہیں، ان میں خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس مقالہ میں مولانا نے اپنے دادا مولانا محمد احسن کا ذکر مولانا برکات احمد کے والد حکیم دائم علی کے استاد کی حیثیت سے کیا تھا، معارف کے ناظرین کی یاد تازہ کرنے کے لئے وہ سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں، جن سے مولانا کے خاندان سے متعلق کچھ مفید معلومات بھی حاصل ہوجائیں گی۔

''......سیدوں کی ایک بستی گیلانی ہے، اس زمانہ میں وہاں کسی سرخ وسفید عمارت

میں نہیں، ہزاروں روپے کے فرنیچر کے درمیان نہیں، بلکہ ایک خام مسجد کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے کھلے ہوئے تخت پر گذشتہ خاک نشینوں کی ایک یادگار صرف حاضری کے رجسٹروں کی تکمیل نہیں کررہا تھا، بلکہ ایک طرف ہدایہ اور تلویح اور دوسری طرف چغمنی اور افق المبین جیسی سنگلاخ کتابوں سے لطیف حقائق اور دقیق نکات ومسائل کے جھرنے جاری کررہا تھا، وہ کسی وقت اگر منطق ومابعد الطبیعیات کے رموز اور پیچیدہ غوامض پر شستہ تقریر کرتا تھا تو دوسرے وقت قاضی بیضاوی کے تفسیری اسرار اور تفتازانی کے بیانی وبدیعی نظرات کو مفت بانٹ رہا تھا، ان کا نام مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھا، جو اپنے وقت میں صوبہ کے سرآمد روزگار فضلاء میں شمار کیے جاتے تھے، اور جن کی تہذیب وتدوین تحشیہ وتصحیح سے طوسی کے اقلیدس کا پہلا مقالہ عربی مدارس میں اس وقت تک پڑھایا جاتا ہے''۔

میرے دل پر مولانا کی خاندانی عظمت کا نقش پہلے ہی سے تھا، مندرجہ بالا سطور پڑھ کر اور بھی گہرا ہوگیا۔

۱۔ مولانا کی علمی شہرت روز بروز بڑھتی جارہی تھی، اور ان کا ذکر ایک شیریں بیان مقرر، جید عالم، لائق معلم اور زود نویس اہل قلم کی حیثیت سے برابر سنتا رہا۔

اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علیؒ کی وفات پر ان کا مرثیہ پڑھ کر دل ان کی طرف اور مائل ہوگیا، مولانا محمد علی مرحوم سے مجھ کو بڑی عقیدت تھی، ان کو محبت واخلاص، ہمت وجرأت، جوش وعمل، ایثار وقربانی، جانبازی وسرفروشی، رواداری اور حب الوطنی کا بہت بلند نمونہ سمجھتا تھا، ان کی قدر اس لیے بھی زیادہ دل میں تھی کہ اگر ایک طرف وہ اعلی

کردار کے محبّ وطن تھے تو دوسری طرف شیر دل مسلمان بھی، اگر غلامی کی زنجیر توڑنے کے لئے ہر سیاسی تحریک میں پیش پیش رہے، تو ساری عمر توحید کے فدائی اور شمع رسالت کے پروانہ بھی رہے، ان کی موت پر سارا ہندوستان سوگوار تھا، دنیا کے گوشہ گوشہ سے ان کے ماتم وشیون کی صدائیں بلند ہوئیں، مشہور انگریز مصنف ایچ۔ جی ویلز نے ان کی رحلت سے متاثر ہوکر یہ کہا تھا کہ ان کا دل نپولین کا تھا، ان کی زبان برک کی تھی، اور ان کا قلم میکاؤلے کا تھا، اور اس وقت کے وزیر ہند مسٹر بن نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ ایک جلیل القدر مسلمان، ایک زبردست محبّ وطن اور عام انسانیت کے ایک عظیم المرتبت پیغمبر تھے، لیکن ان بیانات کو پڑھ کر مولانا محمد علی کے فدائی کی حیثیت سے پندار تو ضرور محسوس ہوتا، لیکن غمناک جذبات کی تسکین نہ ہوئی، مگر ان پر جب مولانا مناظر احسن کا مرثیہ شائع ہوا، تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جراحتِ دل پر مرہم رکھ دیا ہے، اس کو بار بار پڑھ کر دل کو تسکین دیتا، ناظرین بھی اس سے محظوظ ہولیں۔

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی | فدائے ملتِ جانانہ بودی
بہ بزمِ ما رئیس عشق بازاں | بہ رزمِ دشمنان فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بے نوائے | بہ قالب پیکر شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی | وگر نہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشق پاکت | ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
بایمانہا زتو زورے وشورے | بجا نہا ہمتِ مردانہ بودی

چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم | تو شمع دین را پروانہ بودی
رسیدی ازرہ اغیار تا یار | عجب مستے عجب دیوانہ بودی
چہ آمد برسر رنداں کہ آں را | خم و خمخانہ و پیمانہ بودی

ان ہی دنوں یہ روایت ملی تھی کہ مولانا جب حیدر آباد کے ایک تعزیتی جلسہ میں مرثیہ پڑھنے لگے تو خود دھاڑیں مار کر رونے لگے، حالانکہ ان کا خود بیان تھا کہ وہ نہ کبھی مولانا محمد علی سے ملے تھے، اور نہ ان کو دیکھا تھا، لیکن ان سے غیر معمولی محبت رکھتے تھے، جو ان کے دردمند اور حساس دل کے مالک ہونے کی دلیل تھی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب دارالمصنفین آیا تو ایک روز حضرت سید صاحب کی ڈاک میں مولانا کا رسالہ ''النبی الخاتم'' دیکھ کر بڑے شوق سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس کے دیباچہ میں حسب ذیل سطروں پر نظر پڑی۔

''علامہ شبلی مرحوم اور ان کے جانشین برحق مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی ﷺ کے ذریعہ سے اردو زبان کو مضامین سیرت طیبہ سے مالا مال کردیا ہے، تاایں کہ دوسری اسلامی زبانوں کو بھی اردو کی اس جامع، شگفتہ اور مستند کتاب کا ترجمہ کرنا پڑا''

اس کو پڑھ کر یہ خلش بالکل جاتی رہی کہ مولانا کو حضرت سید صاحبؒ سے معاصرانہ چشمک ہے، اور اس پر سید صاحب نے معارف میں ایک بہت اچھا ریویو شائع کرایا جو حسب ذیل ہے:

''النبی الخاتم ....ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جسے مولانا مناظر احسن کے

عقیدت مند قلم نے سجایا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگیِ بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مؤرخین اور ارباب وجد وحال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں، زبان صاف وسادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے''۔

خود مولانا اپنی تمام تصانیف میں اسی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے حضرت سید صاحبؒ نے نجی صحبتوں میں بھی اس رسالہ کی تعریف کی، اور جب مولانا کا ذکر آتا تو ان کے شیریں اخلاق، میٹھی میٹھی باتوں اور لطائف وظرائف کو بڑے لطف سے بیان کرتے، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ دونوں کے درمیان اخلاص ومحبت کی نہریں رواں ہیں، دونوں میں خط وکتابت بھی رہتی تھی، مولانا سید صاحب کو کبھی ''سیدالامام'' کبھی ''سیدی'' اور ''سیدالمسلمین'' لکھ کر مخاطب فرماتے اور اس طرح خط لکھتے جیسے کوئی چھوٹا عزیز اپنے کسی بہت ہی شفیق بزرگ کو لکھتا ہے، کسی میں ان کی علمی اور ادبی فضیلت کا اعتراف کرتے، کسی میں ان کی کسی تصنیف یا مضمون کی داد دیتے، کسی میں ان کے ذاتی اوصاف مثلاً روحانیت، حلم، بردباری، لینت، شرافت کا ذکر کرتے اور غایت انکسار میں اپنے کو محض مور ضعیف ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے، حضرت سید صاحب بھی ان کو ''محبّ اعزواعز'' لکھ کر اپنا مکتوب شروع کرتے اور دونوں اپنے خطوط میں علمی مسائل کے علاوہ خانگی ونجی باتوں سے متعلق بھی ایک دوسرے سے مشورہ کرتے رہتے اور مجھ کو اندرونی طور پر خوشی ہوتی کہ

دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب تر ہیں۔

۱۹۳۷ء سے پہلے مولانا نے تین رسالے لکھے تھے، ''روحانی کائنات''(۱)، ''حضرت ابوذر غفاریؓ'' اور ''النبی الخاتم''، یہ راقم اپنی علمی بے مائیگی کی وجہ سے ان سے اتنا لطف اندوز نہ ہو سکا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا، لیکن ۱۹۳۸ء میں جب الفرقان، کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا اور اس میں مولانا کا مضمون ''الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ'' پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مغلیہ عہد کی تاریخ کی تمام گرہیں کھل گئیں، راقم کا خاص موضوع ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ رہا ہے، اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تیموری دور کی تاریخ سمجھنے میں ایک خاص زاویۂ نظر ملا، دین الٰہی پر مضامین پڑھتا رہتا تھا، ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم میں تو اس کی تفصیل ملتی ہے جو چار سو صفحوں میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ منتشر ہے، مولانا نے پہلی دفعہ ترتیب وتنظیم کے ساتھ اکبر کی اس بدعت سیئہ کا احاطہ کیا، اس لیے مجھ پر ان کی عالمانہ تحقیق وتنقیح کا بڑا گہرا اثر پڑا، ان مباحث کی تعلیل وتوجیہ کے سلسلہ میں جو موشگافیاں انہوں نے کی ہیں ان سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کا اندازہ ہوا، اس مضمون نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیا بات تھی کہ اکبر نے دین الٰہی تو قائم کیا لیکن جہانگیری عہد سے پہلے یہ آپ اپنی موت مر گیا، اور پھر شاہجہانی عہد میں اسلام اور اسلامی روایات کی جو تجدید شروع ہوئی تو عالمگیر کے عہد میں انتہا کو پہنچ گئی اور گو غیر مسلموں کے نزدیک آج عالمگیر اور تعصب مترادف الفاظ بن

(۱) ''کائنات روحانی'' کتاب کا صحیح نام ہے۔

گئے ہیں لیکن اس مضمون کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اکبر نے دینِ الٰہی کے ذریعہ اسلام اور شعائر اسلام کی توہین وتحقیر بلکہ بیخ کنی نہ کی ہوتی تو شاید ہندوستان کی تاریخ میں کوئی عالمگیر نہ پیدا ہوتا، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ بھی جب کوئی اکبر پیدا ہوگا تو کچھ عرصہ کے بعد کوئی عالمگیر بھی ضرور افق پر نمودار ہوگا، مولانا نے اپنے مقالے میں یہ پوری طرح واضح کیا ہے کہ رواداری کے نام پر اکبر نے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ دراصل ارتداد، الحاد اور بے دینی تھی جو اکبر کے بعد بھی مختلف شکلوں میں ابھرتی رہی، حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے پیرو اس کو مٹانے کی کوشش میں لگے رہے، یہاں تک کہ ملک ذہنی حیثیت سے دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا، ایک نے اکبر کے روحانی جانشین دارا کی تائید کی اور دوسری نے عالمگیر کی حمایت کی، دارا شکوہ اکبر کی روایت کو زندہ کرنا چاہتا تھا اور عالمگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں کو روشن رکھنا چاہتا تھا، اس لیے دارا اور اورنگ زیب کی جنگ گو بظاہر تخت وتاج کی لڑائی تھی لیکن دراصل دو نظریوں اور دو تحریکوں کا تصادم تھا، ایک کا سلسلہ اکبر سے ملتا تھا اور دوسرے کا حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے شروع ہوتا تھا، کیونکہ عالمگیر حضرت مجدد کے صاحبزادے حضرت میر معصوم کے حلقہ ارادت میں بھی داخل تھا اور اس کے سیاسی کاموں میں حضرت معصوم کے مشوروں کو بڑا دخل رہا ہے جیسا کہ ان کے مکاتیب سے پتا چلتا ہے، اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جس تجدیدی عمل کی ابتداء جہانگیر سے ہوئی اس کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا، ایک بار حضرت سید صاحب نے راقم سے فرمایا تھا کہ دارا شکوہ تخت پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم

ہوگیا ہوتا، عالمگیر کے تخت پر بیٹھنے سے اس کے بعد مسلمانوں کی سلطنت تو باقی نہیں رہی لیکن اسلام باقی رہا، اس اجمال کی تفصیل سمجھنے میں مولانا کے مضمون سے بڑی مدد ملی اور سچ تو یہ ہے کہ تیموری دور کی تاریخ کا صحیح جائزہ اس وقت تک نہیں لیا جاسکتا، جب تک کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے مقلدین کے کاموں کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے، مولانا نے اپنے مضمون میں ان ہی تاریخی رموز ونکات کی موشگافی کی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد ان کا ایک طویل مضمون حضرت شاہ ولی اللہ پر الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا اس کو پڑھ کر ایک بار پھر تاریخ ہند پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوا اس میں انہوں نے مورخانہ بصیرت کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد میں کس طرح اسلام پر تاریک بادل چھایا ہوا تھا، ہندوستان کے شمالی علاقہ میں سکھوں کی قوت ابھر رہی تھی، جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت کا سیلاب بڑھتا جا رہا تھا، خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے یورپین ممالک کی طاقتیں ہندوستان پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہی تھیں اور خود مسلمانوں کے اندر ایرانیوں، تورانیوں اور روہیلوں کے باہمی تصادم سے اسلامی حکومت کی قبا تار تار ہورہی تھی، بعض صوفیہ کے غلط تصوف اور فقہاء کے غلط تفقہ سے امت کے شیرازے میں انتشار پھیلا ہوا تھا، خود ہندوستانی علماء کا طبقہ قرآن وحدیث کی اصل تعلیم، اصول وفقہ اور عقائد وکلام سے ہٹ کر لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث میں الجھا ہوا تھا، اس تجزیہ میں بھی مولانا کی غیر معمولی مورخانہ ذہانت وذکاوت کا رنگ نمایاں تھا، اور بعض مواقع پر اس لیے بھی حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی

مدارس میں محدود رہی کیسے ان باریک گوشوں تک پہنچی، اس لیے اکثر یہ خیال آیا کہ اگر ان کی
تعلیم خاص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع صرف تاریخ ہند ہی بنالیتے تو شاید ان
کے پایہ کا کوئی مورخ ہندوستان میں نہ ہوتا، مولانا کی نظر ہندوستان کے سیاسی واقعات کے
ساتھ مذہبی رجحانات، تحریکات اور انقلابات پر بھی تھی، اس لیے ان کی نقد وتبصرہ میں بڑی
جامعیت ہوتی تھی جو تاریخِ ہند پر دوسرے لکھنے والوں کو میسر نہیں، اسی مضمون میں انہوں
نے شاہ ولی اللہ کی سیاسی، دینی اور علمی خدمات کی جو تفصیل بتائی ہے اس کا اندازہ اہل نظر اور
اہل فکر ہی کر سکتے ہیں، پھر اس کے لکھنے میں ان پر جو ایک ''حال'' اور ''وجد'' طاری ہے وہ
لائق مطالعہ ہے، ان کا سینہ دینی وملی احساسات سے معمور نظر آتا ہے اور مسلمانوں کی کھوئی
ہوئی عظمت کے لکھنے میں ان کے قلم سے جو تحریر نکلی ہے وہ دراصل ان کے سینہ کے آبلے ہیں
جو کاغذ کے صفحات پر پھوٹ پھوٹ کر بہہ نکلے ہیں، یہ مضمون ایک علاحدہ کتاب ''آغوش
موج کا ایک درتابندہ'' کے نام سے بھی شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۳۹ء کے دسمبر میں میرے وطن میں بعض اعزۂ خاص کے یہاں تقریبات تھیں،
جن میں شرکت کے لئے میں بھی اعظم گڑھ سے گیا تھا، مولانا بھی گیلانی سے تشریف لائے
تھے اور قبل اس کے کہ میں ان کی قدم بوسی کروں، ایک موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میرے
کاندھے پر کسی کا ہاتھ ہے اور اسی کے ساتھ ہی آواز بلند ہوئی ''السلام علیکم عزیزم!'' میں نے
پلٹ کر دیکھا تو مولانا تھے، حیدرآبادی شیروانی میں ملبوس تھے، سر پر حیدرآبادی رومال تھا،
میں کچھ گھبرا سا گیا انہوں نے ازراہ لطف وکرم معانقہ فرمایا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے

گئے، میرے سامنے اس وقت ایک منورہ چہرہ تھا، جس میں نرمی، شگفتگی، پاکیزگی اور
برگزیدگی برس رہی تھی، ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر دل کہتا تھا کہ ان کے قلب میں شاید
معصیت کا وسوسہ کبھی نہ پیدا ہوتا ہوگا، داڑھی سفید ہو چکی تھی، لیکن چہرہ پر اس طرح زیب
دیتی تھی جیسے اسی کے لیے بنائی گئی ہے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن ان میں ذہانت،
مہر اور محبت کی تابانی تھی، دارالمصنفین کے حالات پوچھتے رہے اور یہاں کے ایک ایک فرد
کے متعلق سوالات کیے، ان ہی دنوں ہندوستان کی تاریخ سے متعلق میرے کچھ مضامین
معارف میں شائع ہوئے تھے، ان کا ذکر کر کے ہندوستان کی تاریخ پر ایسی عالمانہ اور دل
کش گفتگو شروع کر دی کہ مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شربت کے گھونٹ میرے حلق سے
اتر رہے ہیں، مہابھارت، رامائن گیتا، البیرونی، ابن بطوطہ، ضیاء الدین برنی پر ایسی مبصرانہ
گفتگو سنی کہ مجھ کو حیرت ہو رہی تھی کہ میں کسی عالم دین، یا دینیات کے معلم کے سامنے ہوں
یا تاریخ کے کسی ماہر کے پاس بیٹھا ہوں، وہ بات کرنے میں ہاتھوں کو تیزی سے حرکت
دیتے تھے جو ان کے لطف بیان پر مہمیز کا کام دیتے تھے، کبھی کبھی وہ آنکھوں کو بند کر لیتے اس
وقت شاید وہ اپنی دور رس نگاہوں کو اس مقام پر پہنچا دیتے جہاں ایک عام اہل علم کی نگاہ کو
پہنچنا ممکن نہ تھا، ان کی آواز میں اتار چڑھاؤ تو مطلق نہ تھا لیکن بڑی شیرینی اور حلاوت تھی،
تنہائی کی یہ صحبت دیر تک نہیں رہی، کیونکہ ان کی باتیں سننے کے لیے کچھ اور ہم وطن بھی
آ گئے اور ان کو موضوع سخن بدلنا پڑا مگر وہ جب تک علمی گفتگو کرتے رہے میں ان کی فکر ونظر
کی گہرائی میں کھویا ہوا محو حیرت بنا رہا اور ان کی نکتہ رسی اور مجتہدانہ طریقۂ فکر کے بوجھ سے

دبتا چلا گیا، اس صحبت میں ان کے کچھ ایسے رشتہ دار بھی شریک تھے جن سے سالے بہنوئی کا رشتہ تھا، اس وقت مولانا خالص بہاری بن گئے اور یہ مجلس بے تکلفانہ فقرہ بازیوں غیر ثقہ جملوں، قہقہوں اور چہچہوں سے گونجتی رہی اور مولانا نے اس وقت کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اہل علم بھی ہیں۔

ان کا قیام اس تقریب میں دو دن رہا دونوں دن برابر ان سے ملنے کی سعادت حاصل رہی ایک موقع پر ان کی خدمت میں تفریحاً عرض کیا کہ آپ کے نام کے ساتھ گیلانی دیکھ کر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا مولانا حضرت عبدالقادرؒ جیلانی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سن کر ہنسنے لگے اور فرمایا ''گیلانی کی نسبت سے مجھ کو گیلانوی لکھنا چاہئے تھا، لیکن شافعی، امام شافعی کے ساتھ نسبت ہے، شافعی اپنے کو شافعوی نہیں لکھتے، پھر اگر میں گیلانی لکھتا ہوں تو اس میں کیا ہرج ہے، یہ بھی فرمایا کہ اکبر کے عہد میں صدر پہانی ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کا ذکر ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں کیا ہے، وہ ایک گاؤں پہانی کے رہنے والے تھے اور پہانوی کے بجائے پہانی کہلاتے تھے، یہ نکتہ آفرینی سن کر مجھ کو ہنسی آ گئی، اتفاق سے ان کی رحلت کے بعد ان کے کاغذات میں بھی اسی قسم کی ایک تحریر دیکھی، وہ اپنی ذہانت سے روزمرہ کی معمولی معمولی سی باتوں میں بڑے بڑے علمی نکتے پیدا کرتے رہتے تھے۔

اسی قیام کے دوران میں حضرت سید صاحبؒ کا ذکر بار بار آیا اور مولانا ان سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے رہے، ایک موقع پر فرمایا کہ میں سید صاحب کی تصانیف کو اس

لیے پسند کرتا ہوں کہ ان سے نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو علمی باتیں پہلے مجمل شکل میں تھیں، سید صاحب کی تحقیق و تدقیق نے ان کو زیادہ مفصل بنا دیا، اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کو زور سے حرکت دیتے ہوئے کہا کہ ان کی علمی کاوش اور محنت کی داد دینے میں بخل کرنا نہ صرف تعصب و تنگ دلی بلکہ ایک قسم کی عقلی و طبعی دناءت ہے، یہ سن کر مجھ کو اور زیادہ انشراح ہوا کہ وہ لوگ کیسے تنگ نظر تھے جو ان پر سید صاحب سے معاصرانہ چشمک کا الزام رکھتے تھے، مولانا نے جب جب سید صاحب پر کوئی مضمون لکھا ان کے علمی کمالات کی داد دل کھول کر دی اور جو گفتگو میں نے ان کی زبان سے سنی تھی، اس کی تفصیل مولانا کے ایک طویل مقالہ ''مولانا سید سلیمان ندوی کا پہلا کارنامہ'' کے عنوان سے ۱۹۴۰ء کے معارف کے پانچ نمبروں میں پڑھی اس کی ابتدا ہی میں ارقام فرماتے ہیں:

> ''نئے حالات نے جدید ذہنیتوں میں جن نئی نئی الجھنوں کو پیدا کر دیا تھا خدا ہی جانتا ہے کہ اعظم گڑھ کے اس زاویہ نشین درویش کے قلم نے ان کی گرہ کشائیوں میں کتنی جلیل و عظیم خدمتیں (انجام) دی ہیں''۔

اسی مضمون میں انہوں نے حضرت سید صاحب کی علمی و تحقیقی کاوشوں کی جس قدر تعریف کی ہے وہ کسی عالم نے اپنے معاصر کے لئے شاید ہی کی ہو۔

۱۹۴۰ء کے بعد وہ علمی دنیا کی فضا میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے، معارف، برہان، الفرقان، مجلّہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کے میگزین ندیم، صدق وغیرہ ان کے قلم کی بارش سے سیراب ہو رہے تھے اور ان کے مضامین کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ

کبھی عالم، کبھی متکلم، کبھی فقیہ، کبھی محدث، کبھی مفسر اور کبھی مورخ کے رنگا رنگ جلووں میں نظر آتے تھے۔

۱۹۴۱ء میں میں ادارہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ان کا ایک طویل مضمون کتاب کی صورت میں ''تدوینِ فقہ'' کے نام سے شائع ہوا، پھر اسی ادارہ کی طرف سے ان کی کتاب ''تدوین حدیث'' کی اشاعت ہوئی میں نے جب جب ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کی کوشش کی تو اپنے کو ان کی فکر وتحقیق کے دریا میں غرق پایا، البتہ ان کی اہمیت حضرت سید صاحب کی گفتگوؤں اور تحریروں سے معلوم ہوئی کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جو عقائد میں کتر بیونت کر کے نئے اسلام کی دعوت دیتے رہے ہیں، لیکن خدا کے کچھ ایسے بندے بھی افق پر نمودار ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی اہلیت واستعداد سے ان بدعات کے گرد وغبار کو ہٹا کر اسلام کے منور آئینہ کو روشن رکھا، مولانا کی مذکورہ بالا کتابیں دراصل ایسے ہی بدعتیوں کے مقابلہ کے لیے لکھی گئیں، ان کی تدوین حدیث پر سید صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ کے مخصوص بندوں نے ایسے بدعتیوں کے ہر تیر کو اپنے سپر سے روکا ہے اور ان کے ہر اعتراض کو دور کیا اور ان کے ہر شبہ کو رفع کیا اور پھر اسی سلسلے میں حضرت سید صاحب نے تحریر فرمایا کہ:

''اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے جو دستہ آگے بڑھا اس کے ہراول میں ہمارے دوست، مناظرِ اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) کا نام نامی ہے جن کے قلم کی روانی اسلام کی

محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے، وہ ہر سال اور سال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقات علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات اور اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین وشکریہ کی مستحق ہیں''۔

ان سطروں میں نہ صرف حقیقت واصلیت کا اظہار ہے بلکہ مولانا کی علمی فضیلت وعظمت جو حضرت سید صاحب کے دل میں تھی اس کا پورے اخلاص کے ساتھ اعتراف ہے۔

۴۴ء میں دفتر الفرقان بریلی سے ان کا ایک رسالہ ''الدین القیم'' شائع ہوا جس میں مولانا نے صوفی اور متکلم بن کر ''صوفیانہ علم کلام'' پیش کیا تھا اور وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مباحث کے ذریعہ کائنات کے اس معمّے کو حل کرنے کی کوشش کی تھی جس کو عقل اور فلسفہ حل کرنے سے عاجز رہا۔

اسی سال ان کی ایک ضخیم کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' حصہ اول (ضخامت ۳۸۶ صفحے) ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی، یہ کتاب بھی عجیب وغریب ہے، اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس میں ابواب یا بغلی سرخی قائم کرنے کو کوشش کرے تو اس کے بس کی بات نہ ہوگی، بلکہ مولانا عتیق الرحمٰن ناظم ندوۃ المصنفین اس کو شائع کرتے وقت اس کے مضامین کی فہرست بھی ترتیب دینے سے قاصر رہے، اور ان کو شروع میں محض چند عنوانات کی فہرست ہی دینے پر اکتفا کرنا پڑا، اس کتاب میں مولانا مسلمانوں کے نظام تعلیم، نصاب تعلیم، طریقۂ درس طلبہ کے قیام وطعام

اور اخلاق وغیرہ پر لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کا قلم بقول حضرت سید صاحبؒ ''منطقی ترتیب'' اور ''مصطلحہ تصنیفی رسوم'' کے بجائے افادیت کا خوگر تھا، اس لیے کتاب میں ایسے ضمنی مباحث بھی بکثرت آگئے ہیں، جن کا تعلق موضوع سے تو نہیں ہے، لیکن وہ بجائے خود مفید ہیں، مولانا خود اس کتاب کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند کے مجلّہ شہریہ ''دارالعلوم'' کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیج دو، دارالعلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے، اسی مناسبت کا خیال کر کے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کر کے میں نے غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب مآثر الکرام کو الٹنا پلٹنا شروع کیا، بعض کارآمد اور دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں، قلم اٹھایا لکھنا شروع کیا، اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہو، قلم رواں ہوا، چلا، چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا اور لکھتا جاتا تھا، پانچ صفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت ۷۵۰ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے''۔

اور پھر یہ پڑھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ سات سو پچاس صفحے کل بیس دن کی مدت میں لکھے گئے، فرماتے ہیں:

''بچوں کو مسلم الثبوت، ہدایہ، بخاری اور ترمذی جیسی درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والے سے کسی تاریخی مضمون کی توقع بھی نہ کرنی چاہیے، وہ بھی کل بیس دن کی یہ محنت ہے، طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اسی میں کچھ فرصت ہمدست ہوئی، لکھتا چلا گیا اور اسی مسودہ کو پریس میں بھیج رہا ہوں''۔

قلم کی اس برق رفتاری اور علم کی اس صاعقہ پاشی کی مثال کم ملے گی، عہد ماضی

کے تعلیمی نظام کے لکھنے میں ان کے ذاتی خیالات بھی بے چین ہو ہو کر قلم سے ٹپکتے چلے گئے ہیں، اور یہ ذاتی خیالات زیادہ تر اس ناوک فگنی کا ردعمل ہے جس کا ہدف مسلمانوں کا مذہبی تعلیمی نظام رہا ہے، جیسا کہ خود مولانا کا بیان ہے کہ ان ٹیسوں اور ہوکوں کی بے چینیاں ہیں، جو ان تیروں کے زخموں نے ان کے دل میں پیدا کر دی تھیں، اس کے دیباچہ کے حسب ذیل فقروں کے پڑھنے کے بعد اس کے مطالعہ کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور اس کے پڑھنے میں ایک کیف محسوس ہونے لگتا ہے۔

''مجھے رُلایا گیا ہے، تب رویا ہوں، ستایا گیا ہوں تب کراہا ہوں، ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مواقع پر میرے نالے ذرا زیادہ بلند ہو گئے ہوں، قابو سے قلم کہیں باہر ہو گیا ہو، اس میں مجھے معاف رکھا جائے''۔

جس سوز و درد کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس کے لحاظ سے اس کا مقبول ہونا لازمی تھا، حضرت سید صاحبؒ نے اس پر تبصرہ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا: ''ہمارے قدیم طریقۂ تعلیم اور اصولِ تعلیم پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں''۔ افسوس ہے کہ اس کی دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔(۱)

اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا نے خود اپنے سے شکایت کی ہے کہ وہ عمل کی قوت سے تقریباً محروم ہو چکے ہیں، اور اب ان میں علمی کام کا نہ عزم ہے اور نہ ارادہ، لیکن ان کی طبیعت میں عجز و انکسار کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی نجی اور معاشرتی زندگی میں بھی اپنی جانب

(۱) اب شائع ہو کر عام ہو چکی ہے۔

کسی وصف کا انتساب پسند نہ فرماتے تھے، مگر فقدان عزم کے اس اعتراف کے باوجود ان کے مضامین ملک کے علمی رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے، ۴۴ء میں ان کا ایک طویل مضمون ندیم گیا میں ''شاد متکلم اسلام کی شان میں'' نظر سے گذرا تو اردو شعر وشاعری میں بھی ان کے پاکیزہ ذوق اور ناقدانہ نظر کا اندازہ ہوا۔

۱۹۴۷ء میں ان کی ایک ضخیم کتاب ''اسلامی معاشیات'' حیدرآباد سے شائع ہوئی جو بڑی تقطیع کے ۴۵۳ صفحے پر مشتمل ہے، اب تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہ تھی، اور غالباً عربی زبان میں بھی اس نوعیت کی کوئی تصنیف نہیں ہے، یہ مولانا کے اجتہاد اور ان کی وسعتِ نظر کی دلیل ہے کہ انہوں نے اسلامی معاشیات پر ایک کتاب لکھ کر معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا ایک مستقل نظام پیش کر دیا، ممکن ہے کہ ان کی ''اسلامی معاشیات'' فنی حیثیت سے ماہرین کی نگاہوں میں اہم نہ ہو، لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ مولانا ہی نے اردو میں اسلامی معاشیات کے لڑیچر کی داغ بیل ڈالی، آگے چل کر اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہوں گی، اور اسلامی معاشی نظام کا ایک واضح اور روشن نقشہ لوگوں کے سامنے آئے گا، لیکن اس فن کی تعمیر کا معمار اول مولانا ہی کو تسلیم کرنا پڑے گا، کلام پاک کی ایسی آیتوں سے جن کی تلاوت ہم روزانہ کرتے ہیں انہوں نے ایسے حقائق پیش کیے ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد ان کی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ابھی اس کتاب کا چرچا اہلِ علم کے حلقہ میں ہو ہی رہا تھا کہ کراچی سے ان کی ایک

دوسری کتاب ''حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' شائع ہوئی، یہ بھی بڑی تقطیع کے ۳۹۹ صفحات پر مشتمل ہے، راقم اپنی نااہلی کی وجہ سے ان کی کسی کتاب پر علمی تبصرہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا، ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہی ارباب علم ونظر کر سکتے ہیں جو خود بھی مولانا کی طرح علوم وفنون کے بحر بیکراں کے شناور ہوں، لیکن ان کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کے قلم سے علم کا دریا بہہ رہا ہے اور دریا کی موجوں کی طرح ان کی تحریر میں اضطراب وتلاطم ہے، اور جس طرح دریا کی پُر شور لہروں میں ہمواری نہیں ہوسکتی، اسی طرح ان کی پرزور تحریروں میں موضوع کے لحاظ سے ترتیب وتنظیم نہیں ہوتی، وہ خود ایک مکتوب میں حضرت سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں، پھر اس کی نظر ثانی، حک واصلاح میرے لئے مشکل ہوتی ہے، میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کرلیں''۔

لیکن جن چیزوں کو وہ خرافات سمجھتے تھے، وہ اب بیش بہا معلومات کا خزانہ معلوم ہوتی ہیں، ان کے مضامین اور تصانیف میں موضوع سے غیر متعلق باتیں بکثرت ہوتی ہیں جن سے ان کی تحریر میں بڑی طوالت ہوتی ہے جو بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کردیتی ہے، پھر تحریر کے آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اطناب کے بادشاہ تھے، وہ کوزہ کے چند قطروں کو اپنے سیال قلم سے سیلاب بنادیتے تھے، اور ایسا کرنے میں ان کو کوئی غیر معمولی محنت ومشقت نہ کرنی پڑتی، وہ جیسے بولتے تھے ویسے ہی لکھتے تھے، اسی لیے ان کی تحریر

میں تکلف اور تصنع نہیں پایا جاتا، اگر ان سے ادنی سے ادنی بھی گفتگو کرتا تو اس میں بھی اپنی
ذہانت سے کوئی نہ کوئی عالمانہ یا معلمانہ نکتہ ضرور پیدا کر دیتے، یہی حال ان کی تحریر کا تھا، کہ
بات میں بات پیدا کرتے چلے جاتے تھے، حافظہ بڑا قوی تھا، جو چیز کہیں ایک بار پڑھ لیتے وہ
ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی، اور جب لکھنے بیٹھتے تھے تو حافظہ اپنی پوری تحویل ان کے حوالہ کر دیتا،
اور وہ ان سب کو اپنی تحریر میں سمیٹنے کی کوشش کرتے اور ان کے سمیٹنے میں ان کا قلم بالکل نہ تھکتا،
اور جب ایک بار چل جاتا تو پھر نہ رکتا، افسوس ہے کہ ان کی صحت نے ان کے قلم کا ساتھ نہیں
دیا، ورنہ کمیت کے لحاظ سے کوئی معاصر اہل قلم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، پھر بھی انہوں نے
جس قدر لکھ دیا ہے اس کی کیفیت سے وہی لطف اندوز ہو سکتے جو خود بھی اہلِ نظر اور دیدہ ور ہیں،
یہ ضرور ہے کہ ان کے مضامین میں تہذیب و تنظیم کے بجائے ایک قسم کا انتشار ہے جو دراصل
ان کی علمی شوریدگی کا نتیجہ ہے، اس کے باوجود ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جو فکر و نظر کی گہرائی اور
وسعت سے خالی ہو، یا جس میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نمایاں نہ ہو، ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ وہ خالی اوقات میں سوچا کرتے تھے، اور جب لکھنے بیٹھتے تو سفینہ ان کے علم سینہ کا متحمل
نہیں ہوتا تھا، وہ اپنے غور و فکر کے سارے نتائج کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں تک پہنچا دینے کی
کوشش کرتے تھے، جو فائدہ اٹھا سکتے تھے، علم کے ایک معلم سے یہی توقع کی جاتی ہے، اس لحاظ
سے وہ اپنے مضامین اور تصانیف میں عالم اور معلم دونوں نظر آتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ علم کی
عظمت و برگزیدگی کے قائل رہے، اس لیے اس کا کبھی ''بیوپار'' (۱) نہیں کیا، وہ کتاب لکھ کر

(۱) یہ لفظ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے ایک مضمون سے مستعار ہے۔

ناشر کو دے دیتے، وہ چھپ کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ بھی جاتی اور ان کو خبر تک نہ ہوتی،
ان کو جب معلوم ہوتا تو کبھی ناشر کو لکھ منگواتے، یا کوئی لا کر دے دیتا تو دیکھ کر خوش ہو جاتے کہ
چھپ گئی، اور یہی ان کی ساری محنت کا صلہ ہوتا، معاوضہ یا رائلٹی قبول کرنا مطلق پسند نہ کرتے
تھے، اور پھر اپنے علمی کارناموں کے رد و قبول اور داد و تحسین سے بھی بے نیاز تھے، ایک موقع پر
راقم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

> ''غریب مضمون نگاروں اور کتب سازوں کی محنت و زحمت کا اندازہ وہ طبقہ کیا کرسکتا
> ہے جو صرف پڑھ کر کتاب کو چھوڑ دیتا ہے، دس منٹ میں جو مضمون پڑھ لیا جاتا ہے، بسا
> اوقات اس کی تیاری میں دس مہینے صرف ہوتے ہیں، اپنی کاریگری سے کاریگر کو جو خوشی
> ہوتی ہے وہی کام کا کافی صلہ ہے''۔

اور غالباً وہ اردو کے تنہا مصنف ہیں جن پر کسی اہل قلم نے حریفانہ یا معاصرانہ
تنقید یا خردہ گیری کی جرأت نہیں کی، جو ان کے علمی اخلاص کی ایک بڑی دلیل ہے۔

وہ بڑے شیریں بیان مقرر بھی تھے، یہ برابر خبر ملتی تھی کہ حیدرآباد میں عید
میلاد النبی کے موقع پر حضور نظام خاص طور پر ان کی تقریر سننے کے لئے شریک ہوتے ہیں،
وہ اپنی تقریروں میں بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بیان کرتے، جن سے سامعین بہت محظوظ
ہوتے، ان کو واعظانہ رنگ کے علاوہ تبلیغی، علمی اور کبھی کبھی سیاسی تقریر کرنے میں بڑی
قدرت حاصل تھی، وہ اپنی تقریر کی ''متین شوخی'' سے لوگوں کو ہنساتے تو اپنے عالمانہ
استدلال اور عارفانہ نکتہ وری سے ان کو متاثر بھی کرتے تھے۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں وطن جاتے ہوئے بہار شریف پہنچا تو میرے پہنچنے سے ایک روز پہلے وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا سیاسی جلسہ تھا، اس میں مولانا کو تقریر کرنے کے خاص طور پر مدعو کیا گیا، میں تقریر سننے کی سعادت سے تو محروم رہا، لیکن ہر شخص کی زبانی ان کی پر جوش تقریر کا ذکر سنا، اور پھر جب میں مولانا سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو ان کے ارد گرد بہت سے لوگوں کو پایا جو ان کی تقریر کی تعریف کر رہے تھے، مگر وہ اپنے مزاحیہ انداز میں اس مدح سرائی کا موضوع بدل دینے کی کوشش کرتے، ان میں کبھی بھی تشخص پسندی نہیں آئی، اسی لیے وہ اپنی فضیلت اور برگزیدگی کی داد لینے یا سننے میں ہمیشہ مستغنی اور بے نیاز رہے، حالانکہ وہ خود ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑے فیاض تھے، بلکہ بعض دوستوں کے اوصاف بیان کرنے میں تو قصیدہ خواں ہو جاتے، ان کے ہم چشموں میں شاید ہی کسی کو ان کی تحریر سے کوئی تکلیف پہونچی ہو، ان کی طبیعت میں بڑی مٹھاس تھی، اس لیے نجی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نہ نکلتی جس سے کسی کی دل آزاری ہو، بعض اوقات تو اسی شفقت و محبت میں نو آموز اہل قلم کے لیے ایسے تعریفی کلمات لکھ جاتے جن کا وہ مستحق نہ ہوتا، لیکن ان کی تعریف یا داد دل بڑھانے اور کام کا حوصلہ پیدا کرنے کی خاطر ہوتی، اور ان کی اس مخلصانہ فراخدلی نے ان کے بہت سے شاگردوں کو اہلِ قلم اور مصنف بنا دیا، اور ان کے احباب تو ان کے علم و فضل کے علاوہ سیر چشمی، رواداری، جوہر شناسی، قدردانی، مرنجاں مرنج طبیعت اور مزاج کی شگفتگی سے ہمیشہ ان کے گرویدہ رہے۔

مولانا کی زندگی علمی کاموں سے معمور رہے، لیکن ہنگامے کے کاموں سے بالکل

پاک رہی، ان کی داستانِ حیات بس اتنی ہے کہ پڑھتے رہے، پڑھاتے رہے، لکھتے رہے لکھاتے رہے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن گیلانی میں پائی، وہاں سے ٹونک گئے، جہاں مولانا برکات احمد ٹونکی کے حلقۂ درس میں نو سال تک رہے، پھر دیوبند گئے، اور مولانا محمود حسنؒ، علامہ انور کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا اصغر حسینؒ سے فیضیاب ہوئے، طالب علمی ہی کے زمانہ میں دیوبند کی مجلس شوریٰ میں طلبہ کی طرف سے نمایندہ منتخب ہوئے جو اس زمانہ میں بڑا اعزاز تھا، دارالعلوم کے ماہوار رسالوں، ''القاسم'' اور ''الرشید'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی جس کے معاوضہ میں تیس روپے ماہانہ مقرر ہوئے، جب ان کے مضامین القاسم میں شائع ہوئے تو اکبرالہ آبادی نے ان کو بہت حوصلہ افزا خطوط لکھے، دیوبند سے آکر کچھ دنوں مونگیر میں ندۃ العلماء کے بانی مولانا محمد علی رحمۃ اللہ کی خانقاہ میں بھی رہے، ان کا خود بیان ہے کہ ''یہاں کی خانقاہی زندگی میں ندوۃ العلمائی رنگ جاری و ساری تھا'' جس کا اثر ان پر بھی پڑا، حضرت سید صاحبؒ ان کے متعلق فرماتے کہ وہ کسبی ندوی نہیں، وہبی ندوی ہیں، یعنی تعلیم کے لحاظ سے تو ندوی نہیں لیکن اپنے فطری ذوق کی بنا پر ندوی ہیں، مونگیر میں مولانا محمد علیؒ نے ان کو تبلیغی کاموں میں لگایا، وہ چونکہ شروع ہی سے اچھے واعظ اور مقرر تھے، اس لیے اس کام کو اچھی طرح انجام دیا، مولانا محمد علیؒ کے خاندان سے ان کا رشتہ بھی ہو گیا تھا، ان کی ایک بہن مولانا محمد علیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا لطف اللہ مرحوم سے منسوب تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد وہ مونگیر سے پھر دیوبند بلا لیے گئے اور پچاس روپے ماہانہ پر

القاسم کی ادارت پر مامور ہوئے، اسی زمانہ میں کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار انڈین ڈیلی نیوز نے رسول اللہ ﷺ کی شانِ مبارک میں کوئی گستاخانہ تحریر شائع کی، تو علماء کی ایک جماعت کلکتہ پہنچی، جس میں مولانا مناظر احسن بھی تھے، ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت اس قدر جوش میں آئی کہ شاتم رسول اور اس کے ہم مذہبوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا، کلکتہ کے ایک دوسرے اخبار ''اسٹیٹس مین'' نے ایک افتتاحیہ لکھ کر حکومت کو ان کے خلاف ابھارا، اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں، مولانا کے دوستوں اور ہم وطنوں نے ان کو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا، اور وہ زبردستی ممبئی اور مدراس کے راستے سے دیوبند روانہ کردئے گئے، مگر راستے میں عید کا چاند دیکھ کر حیدرآباد اتر پڑے، وہاں مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملاقات ہوئی، اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی، مولانا حمید الدین نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا، وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لیکن خود دیوبند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہوگا، اس لیے انہوں نے درخواست دے دی، ان کا تقرر ایک سال تک یونورسٹی میں نہ ہوسکا، اس درمیان میں وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے درس لیتے رہے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس زمانہ میں حیدرآباد کے صدر الصدور تھے، اور وہاں کے دینی وعلمی سرگرمیوں کا مرکز تھے، اسی لیے مولانا فراہیؒ مولانا گیلانیؒ کو ان کے پاس لے گئے، اور یہ کہا: ''ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں''۔ شروانی صاحب نے فرمایا: ''یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی'' مولانا گیلانی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''انکے لطف وکرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس ملاقات کے بعد

شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کردیا، عثمانیہ یونورسٹی میں تقرر سے پہلے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں مولانا علیل ہوگئے، اور مستقل کھانسی اور بخار رہنے لگا، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ان کو اپنے ساتھ علیگڑھ لے گئے اور وہاں علاج کرایا، اس کے بعد وہ اپنے وطن گیلانی چلے گئے، یہاں آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا، اور وہ ۱۹۲۰ء میں شعبۂ دینیات کے استاد مقرر ہوگئے، اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، پانچ سو پنشن ملی، لیکن اس گراں قدر تنخواہ اور پنشن کے باوجود اپنی پرانی سادگی کسی حال میں نہیں چھوڑی، حیدرآباد کے قیام میں زیادہ تر ایک مسجد کے حجرہ میں رہے۔

جب بوڑھے ہوکر ریٹائر ہوئے اور گیلانی میں آکر قیام کیا تو ان کا قلم اور بھی جوان ہوگیا اور آخر تک وہ علمی کام کرتے رہے، وہ حضرت شیخ محی الدین بن عربی سے بہت متاثر تھے، اور ان کے کارناموں کو تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لیے ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم میں وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر لوگوں کے لیے بسا اوقات ان کی باتیں نقصان رساں ہوجاتی ہیں، لیکن یہ ان کے کلام کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا نقصان ہے''۔

ان میں تمام شرائط موجود تھے، اس لیے شیخ اکبر کو ان سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا، لیکن اس کام کو شروع کرنے سے پہلے ان کا قلم مختلف سمتوں میں چل رہا، اور مختلف قسم

کے مضامین کے ساتھ ساتھ ان کا قلم مولانا محمد قاسمؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے سوانح پر چل پڑا تو ایک ہزار صفحے لکھ کر رکا، جب اس کا مسودہ دیوبند پہونچا تو وہاں کے اہل علم نے اس کو تین جلدوں میں تقسیم کیا، دوجلدیں تو چھپ گئی ہیں، ایک جلد ابھی باقی ہے۔

وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن تو عرصہ سے تھے، پنشن کے بعد مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے، مارچ ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ ہوا، اس میں شرکت کے لیے وہ گیلانی سے اعظم گڑھ تشریف لائے، میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے میرے ہی قیام گاہ میں قیام فرمایا، اس جلسہ میں مولانا کے علاوہ جناب ڈاکٹر سید محمود (جو اس وقت بہار میں وزیر ترقیات تھے) مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد عمران خاں مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے تھے، جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لیے اسٹیشن گئے تو مولانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے، ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک چادر، ایک تکیہ، المونیم کا ایک لوٹا، اور ایک کپڑے میں لپیٹے ہوئے ایک دو جوڑے کپڑے تھے، خود ان کی ذات بھی نمود ونمائش کی آلائشوں سے پاک تھی، یہ دارالمصنفین میں ان کی پہلی تشریف آوری تھی، اس لیے یہاں ایک ایک فرد سے بڑی گرم جوشی اور محبت سے ملے۔

ان بزرگوں کے آمد سے دو تین دن تک دارالمصنفین میں بڑی چہل، پہل رہی، دارالمصنفین کے لوگوں کے علاوہ شہر کے معززین کا بھی اجتماع رہتا، لیکن ہر محفل میں مولانا ہی بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے، مذہبی، علمی، تاریخی، سیاسی جو موضوع بھی زیر بحث

ہوتا، مولانا اپنی طباعی اور ذہانت سے کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ پیدا کر دیتے کہ حاضرین ان ہی کی طرف مائل ہو جاتے، ان کی گفتگو میں ایسی رنگین سنجیدگی اور متین شوخی ہوتی کہ پوری مجلس زعفران زار بن جاتی، اور ان قہقہوں میں بھی لوگ یہ محسوس کرتے کہ ان پر حکمت و دانش کی بارش ہو رہی ہے۔

سقوط حیدرآباد کا ذکر آیا، تو فرمایا کہ ایک روز قاسم رضوی اپنے رضا کاروں کے دستے کے ساتھ ان کے مکان کے احاطے میں چلے آئے، اور دیر تک فوجی قواعد کرتے رہے، اسی احاطہ میں مسجد بھی تھی، لیکن جب مغرب کی اذان ہوئی تو قاسم رضوی کے سوا ان مجاہدوں میں سے کسی نے بھی خانۂ خدا میں آنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، نماز کے بعد مولانا نے قاسم رضوی سے فرمایا کہ تمہارے مجاہدوں کی قوتِ ایمانی تو آج دیکھ لی، تمہاری جو فوجی وحربی قوت ہے اس کا حال تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے، پھر ایک بڑی طاقت کے خلاف کس برتے پر لڑنے چلے ہو، قاسم رضوی نے کہا چیختا ہوں، چلاتا ہوں، شاید کارگر ہو جائے، مولانا نے یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا: ''یہ کتنی بڑی نادانی تھی''۔

اسی قیام میں جماعت اسلامی کے ایک پرجوش کارکن نے ان کو اپنی جماعت کا مخالف سمجھ کر ان سے مناظرانہ رنگ میں بحث شروع کر دی، لیکن مولانا کی صلح پسندی اور شاداں وفرحاں طبیعت میں کسی کی دل آزاری کی گنجایش ہی نہیں تھی، اس لیے بحث کرنے کے بجائے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا کہ ''بھائی یہ بتاؤ کہ مولانا مودودی رسول اللہ ﷺ کے سگے بیٹے ہیں، اور ہم سب انکے سوتیلے بیٹے ہیں کہ وراثت میں مولانا مودودی ہی تنہا

اسلام کو صحیح سمجھنے کا حق رکھتے ہیں، اور ہم کو کوئی حق نہیں''، مولانا کے کہنے کے انداز میں کچھ ایسی دل آویزی تھی کہ اسی پر بحث قہقہوں میں گونج کر ختم ہوگئی۔

ایک دوسرے موقع پر کسی سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بہار شریف میں ایک عربی مدرسہ ہے، وہاں کے طلبہ کو ایک مدرس سے شکایت تھی کہ وہ اچھا نہیں پڑھاتے، میں ایک بار عثمانیہ یونیورسٹی کی چھٹیوں میں حیدرآباد سے اس قصبہ میں پہنچا تو مدرسہ کے متولی صاحب نے اصرار کیا کہ میں اس مدرسہ میں ایک سبق پڑھادوں، میں نے ان کی خواہش کی تعمیل کردی، درس سے طلبہ بہت خوش اور مطمئن ہوئے، متولی صاحب نے مدرس سے مخاطب ہوکر کہا کہ ''آپ بھی ایسا ہی کیوں نہیں پڑھاتے؟'' مدرس نے جز بز ہوکر کہا ''مولانا بارہ سو پاتے ہیں، پلاؤ، قورمہ کھاتے ہیں، جیسا کھاتے ہیں ویسا پڑھاتے ہیں، میں تیس روپے پاتا ہوں، دال بھات کھاتا ہوں، جیسا کھاتا ہوں ویسا پڑھاتا ہوں''۔ یہ جواب سن کر متولی صاحب خاموش ہوگئے، مولانا جب یہ واقعہ سنا رہے تھے تو ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف فرما تھے جو اس وقت حکومت بہار کے وزیر تھے، اور پہلے وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے، مولانا نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ ملک میں زیادہ تر دال روٹی پر گزارہ کرنے والے ہی تعلیمی اور علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اور پھر اسی سلسلہ میں فرمایا کہ ''نان شعیر'' ہی پر ''قوتِ حیدری'' اور ''قوتِ ایمانی'' کا مدار رہا ہے، ہندوستان کے بزرگانِ دین اور خصوصاً صوفیہ کرام نے فاقے کرکے یہاں کے لوگوں کے اخلاق وکردار کو سنوارا ہے، اور یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت خواجہ نظام الدین

اولیاء کے خلفاء میں ایک بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور گزرے ہیں، جو ہانسی میں رہتے تھے، سلطان محمد تغلق وہاں گیا، تو شہزادہ فیروز کو ایک لاکھ ٹکے دے کر ان کی خدمت میں بھیجا، شیخ نے اتنی بڑی رقم دیکھ کر فرمایا، یہ درویش ایک لاکھ ٹکے لے کر کیا کرے گا، درویش کے لیے تو دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے، جب ان سے زیادہ اصرار کیا گیا تو صرف دو ہزار رکھ لیے، اس میں سے کچھ تو اپنے مرشد کے مزار کے لیے اور بقیہ فقراء میں تقسیم کردئے۔

دارالمصنفین کی یادگار مجلسوں میں ایک مجلس یہ بھی تھی اور جب یہ مجلس یاد آتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ زندگی کے جو دن اس میں گزرے وہ بہترین دنوں میں سے تھے، مولانا جب رخصت ہونے لگے تو ان کی خدمت میں دارالمصنفین کی طرف سے مصارف سفر پیش کیے گئے، انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار فرمایا کہ میں تو اپنے گھر آیا ہوں، گھر والوں سے اخراجات لینا کیا معنی؟ ان کے اس اخلاص سے دارالمصنفین کا ہر فرد متاثر ہوا۔

مئی ۱۹۵۱ء میں جب راقم الحروف گھر گیا، تو قدم بوسی کے لیے گیلانی جانے کا قصد کیا، لیکن اہلِ وطن نے مولانا کو میلاد النبی کی ایک مجلس میں تقریر کرنے کے لیے اصرار سے مدعو کیا تھا، وہ اس وقت قلب کے مریض ہو چکے تھے، ڈاکٹروں نے تقریر کرنے کی ممانعت کردی تھی، مگر وہ اپنی خلقی مروت میں عزیزوں کی فرمائش رد نہ کرسکے، اور دیسنہ تشریف لائے، یہ ان کی تقریر سننے کا پہلا اتفاق تھا، رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارک سورۂ ''والضحیٰ'' کی تفسیر کی روشنی میں بیان کی، اس بیان کا طرز تو سیدھا سادہ تھا، مگر اس قدر موثر

تھا کہ پوری مجلس رسول اکرم کے جام محبت سے سرشار اور مخمور ہو رہی تھی، اس زمانہ میں گاؤں والے تقسیم ہند کے نتائج سے متاثر تھے، ان میں بڑی یاس و نا امیدی چھائی ہوئی تھی، مولانا نے ان کی تسکین و تسلی کے لیے بڑی وضاحت سے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے دو حصہ ہیں، ایک مکی اور ایک مدنی، ہندوستان کے مسلمانوں کو آپ ہی کے اسوۂ حسنہ پر چل کر اب مکی زندگی بسر کرنی ہے، انہوں نے اس کو کچھ ایسے دلنشیں انداز میں بیان کیا کہ گاؤں والوں کو بڑی ڈھارس ہوئی، تقریر کے آخر میں مگھی زبان میں ایک نعت پڑھی جو ان ہی کی فکر سخن کا نتیجہ ہے، ان کے پڑھنے کے انداز میں کچھ ایسا درد و اثر تھا کہ ان کی مترنم آواز آج تک کانوں میں گونج رہی ہے، اس نعت کا ایک بند ذیل میں درج ہے، شاید ناظرین کو بھی لطف حاصل ہو۔

دنیا بھٹکی پھرتی، چھاگلئے تھا اندھیا لارے
دکھی سکھی راجہ پرجا سگرو تھ متوالارے
من کی سونی نگری پر پڑل تھے کئی تالا رے
جنّے دیکھو چورے چور، کوئی نہیں رکھوالا رے
بپتا کی ان گھڑیوں میں آئی گیو کملی والا رے

اس قسم کی نعت میں وہ اپنے کو ’’سوامی جی گیلانی والے‘‘ کہتے تھے، جولائی ۱۹۵۳ء میں ان کی قدم بوسی کیلئے گیلانی حاضر ہوا، گو یہ گاؤں راقم کے دیسنہ سے صرف سے صرف دو کوس کے فاصلہ پر ہے، لیکن ایک عرصہ کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا، گیلانی

پہنچا تو سواری کا یکہ آموں کے ایک بڑے باغ میں رکا، معلوم ہوا کہ یہ مولانا کا ہی باغ ہے، اس کے مقابل کئی بیگھے کا ایک اور بڑا سرسبز و شاداب باغ نظر آیا، یہ بھی مولانا ہی کا تھا، باغ کے بعد ایک چھوٹے سے چمن سے گزر کر مولانا کی مردانہ نشست میں پہنچا، یہ ایک دو منزلہ چھوٹی سی عمارت تھی، جو مولانا نے خاص اپنے لیے بنوائی تھی، اسی سے متصل ایک بہت بڑا دو منزلہ زنان خانہ تھا، مردانہ نشست کے سامنے ایک تالاب تھا، اس سے ذرا کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا آم کا ایک اور باغ تھا، یہ بھی مولانا ہی کا تھا، ان کو آموں سے بڑا ذوق تھا، بہار، حیدرآباد، بمبئی، لکھنؤ اور ملیح آباد کے مشہور آموں کے درخت انہوں نے منگوا کر لگائے تھے، اور جس طرف ان کی نظر اٹھتی ان کو اپنے لگائے ہوئے باغ نظر آتے تھے، ان کے مکان اور باغات کو دیکھ کر ان کی فارغ البالی اور خوشحالی کا اندازہ ہوتا تھا، مگر خود ان کی سادگی دیکھ کر ان کے علم کی گہرائی کا یقین نہ آتا تھا، اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی سادگی پر تعجب ہوتا، ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی، اسی پر قلم اور دوات رکھ لیتے، اور علم و فن کا خزانہ لٹاتے رہتے، چارپائی کے بغل میں دو تخت تھے، ان پر معمولی سا فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا، قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا، ان کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے، کمرے میں چار بڑی بڑی الماریوں میں منتخب کتابیں تھیں، یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا، لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے، تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک معمولی سا ڈبہ گھسیٹتے، اس میں مٹی کے تین کلہڑوں میں کتھا، چونا، اور ڈلی تھی، اور کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان لپٹے ہوتے، یہ پاندان

ان کی ساری زمینداری، کھیتی، باغ اور گرانقدر تنخواہ کا حاصل تھا، جس کے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے، بقیہ کسی اور چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا، اس ڈبّے سے پان کی گلوری بناتے اور اس کو کھا کر پھر تروتازہ ہوجاتے، اور ان کا نہ تھکنے والا قلم پوری تیزی سے رواں ہوجاتا، جب ان کی نظر اپنے باغوں کی طرف اٹھ جاتی تو قلم اور تیز ہوجاتا، شاید ان کے سبب سے اچھے مضامین اس زمانہ میں لکھے گئے جب درختوں کے خوش رنگ آم کے کیف وسرور میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

ان کے صرف دو اولاد تھی، صاحبزادے اس وقت پاکستان میں ایڈمسٹریٹو سروس میں ہوگئے تھے۔(۱) صاحبزادی ان کے منجھلے بھائی مکارم اُحسن صاحب کے صاحبزادہ سے بیاہی ہوئی ہیں، مولانا کی ساری دلچسپی ومحبت مکارم احسن صاحب ہی کے ساتھ تھی، وہی ان کے ذہنی اور قلبی سکون کے سرچشمہ تھے، اگر مولانا کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جاتا جہاں آموں کا ایک باغ ہوتا، اور ان کے سامنے مکارم احسن صاحب ہوتے اور ان کو قلم، دوات اور کاغذ دے دیا جاتا تو وہ یہی سمجھتے کہ ان کو جنتِ نعیم کی ساری نعمتیں مل گئی ہیں، گیلانی میں ان کو یہ ساری چیزیں میسر تھیں، اسلیے وہاں سے ہٹنا کسی حال میں پسند نہ کرتے تھے، صاحبزادے نے بار بار اپنے یہاں بلایا، پنجاب یونیورسٹی میں ان کو ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی جگہ پیش کی گئی، کراچی یونیورسٹی نے اصرار کے ساتھ بلایا، لیکن انہوں نے اپنی جنت کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کی، ان کو اپنے کمرہ کی کھرّی چارپائی پر دنیا کی ساری لذتیں حاصل

(۱) اب ان کا انتقال ہوگیا۔

تھیں، اسی پر بیٹھ کر وہ لکھتے رہتے تھے، اور مکارم صاحب اپنے دیہی کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور جب وہ کھیت اور باغ کو دیکھ کر واپس آتے تو مولانا قلم چھوڑ دیتے، پھر ان کی زبانی باغ کی کیاریوں، کھیتوں، مینڈوں اور کاشتکاروں کے جھگڑوں کی باتیں ایسی دلچسپی سے سنتے کہ معلوم ہوتا کہ ان کے لئے اس سے زیادہ لذیذ تر حکایت اور کوئی نہیں، جب کوئی اہلِ علم کہیں سے ملنے کے لیے آجاتا اور مکارم صاحب موجود ہوتے تو مولانا خود خاموش ہوجاتے اور مکارم صاحب ہی علمی گفتگو شروع کردیتے جو مولانا کی کہی ہوئی باتوں کی صدائے بازگشت ہوتی، لیکن مولانا اس کو بڑے غور وانہاک سے سنتے، اور شاید وہ غایت محبت میں مکارم صاحب کو اپنے سے زیادہ علم کا اداشناس اور نکتہ ور سمجھنے لگے تھے، جب مکارم صاحب اٹھ کر چلے جاتے تو مولانا کے منہ سے پھر موتی جھڑنے لگتے ان کے اس وصف کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

اس ملاقات میں ان کی حکیمانہ ظرافت سے دن بھر محظوظ ہوتا رہا، ایک موقع پر جب ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کا ذکر آیا تو بڑے اذعان واعتماد کے ساتھ فرمایا کہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل روشن پاتا ہوں اور اس کی وضاحت میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا، کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید کا لڑکا اسلامیہ اسکول میں تعلیم پاتا تھا اس کے باوجود اس کے عقائد خراب تھے، مرید نے حضرت مولانا سے اس کی شکایت کی، انہوں نے فرمایا لڑکے کو اسلامیہ اسکول سے نکال کر کسی غیر مسلم اسکول میں داخل کرو، مرید نے ایسا ہی کیا، کچھ دنوں کے بعد مرید نے اطلاع دی کہ لڑکا اب پھر اسلام

کی طرف مائل ہورہا ہے اور کچھ دنوں کے بعد بالکل صحیح راستے پر آگیا، مرید نے مولانا تھانویؒ سے پوچھا کہ یہ طریقۂ علاج سمجھ میں نہیں آیا، مولانا نے فرمایا کہ لڑکا جس ماحول میں تھا، اس کے خلاف جانا پسند کرتا تھا، اس لیے جب وہ غیر مسلم اسکول میں چلا آیا تو وہاں کے ماحول کے خلاف اسلامی شعار کی طرف مائل ہوگیا، مولانا گیلانیؒ نے یہ واقعہ بیان کرکے فرمایا کہ پاکستان کے مسلمان اپنے نئے ماحول میں کیا ہوجائیں گے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جور دعمل ہوگا وہ میری نظر میں امید افزا ہے، ان میں مذہبی احساسات اور ملی جذبات کی بنا پر غیر شعوری طور سے پوری قوتِ مدافعت موجود ہے، جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی، جیسا کہ صدیوں سے رہی ہے، ہندوستان میں باہر سے جو قومیں آئیں، وہ سب یہاں کی قوموں میں ضم ہوگئیں لیکن مسلمانوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی، ان کی مذہبی غیرت وحمیت میں بڑا استحکام ہے، جو کمزور ہوسکتا ہے لیکن ختم نہیں ہوسکتا، اس پر ضرب کاری پڑسکتی ہے، لیکن اس کا کوئی استیصال کرنا چاہے تو ممکن نہیں، مولانا کچھ اس یقین کے ساتھ گفتگو فرمارہے تھے کہ مجھ کو بھی ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر نہیں آرہا تھا۔

اس ملاقات کے چار مہینے بعد جب نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا نے حضرت سید صاحب کے انتقال کی خبر کراچی ریڈیو سے سنی، تو کلیجہ تھام کر زمین پر بیٹھ گئے، اور ان کو محسوس ہوا کہ ان پر قلب کا شدید حملہ ہوا ہے، جس سے وہ جانبر نہ ہوسکیں گے، اسی پریشانی میں ان کی زبان سے نکلا:

آج محفل علم کی افسوس سونی ہوگئی — دین ودانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار
اب کرے گا کون ہم میں دین کے اسرار کو — کاوش تحقیق کی صیقل گری سے آشکار

پھر اس میں کچھ اور اشعار بڑھا کر پورا ایک مرثیہ لکھدیا، جس کی ایک نقل دارالمصنفین کو بھی بھیجی، حضرت سید صاحب کی رحلت پر پورا دارالمصنفین سوگوار تھا، ان کے اس مرثیہ نے اور بھی سوگوار بنادیا، اور جب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت سید صاحب کی تعزیت میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جلسہ کیا تو مولانا نے اپنی ناسازی طبع کے باوجود اس میں شرکت کے لیے گیلانی سے لکھنؤ کا سفر کرنے کی زحمت گوارا کی، اس جلسہ کے ایک اجلاس کی صدارت بھی انہوں نے کی تھی اور حضرت سید صاحب پر ایک طویل مقالہ بھی پڑھا تھا، وہ اندرونی طور پر تو بہت مغموم اور ملول تھے، اور مقالہ پڑھنے میں ان کے آنسو رواں ہوجاتے تھے لیکن ان کی سدا بہار طبیعت کی شگفتگی اور سنجیدہ ظرافت کا اظہار بھی موقع بموقع ہوتا رہا، حضرت سید صاحب پر مقالہ پڑھ رہے تھے تو سیرۃ النبی کے سلسلہ میں ایک مقام ایسا آیا، جس کی وضاحت ایک زبانی لطیفہ کے ذریعہ سے کی، فرمایا کہ والد صاحب کو اپنی کسی جائداد کے سلسلہ میں عدالتی کاروائی کرنی پڑی، اس مقدمہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں ایک ہندو مجسٹریٹ ان کے یہاں آیا اور ہمدردانہ پوچھا کہ اگر آپ کے خاندان میں کوئی ولی گذرا ہے تو میں کاغذ میں ذکر کردوں، والد صاحب نے فرمایا کہ کوئی ولی تو نہیں گذرا ہے لیکن نبی (۱) گزرا ہے، مجسٹریٹ نے کہا نبی سے کام نہیں چلے گا ولی کی

(۱) یہ واضح رہے کہ مولانا نسباً سید تھے۔

ضرورت ہے، اس کی نظر میں نبی سے زیادہ ولی کی اہمیت تھی۔

اس موقع پر ندوۃ العلماء میں بڑا شان دار اجتماع ہوا تھا، لکھنؤ کے علاوہ بھوپال، پھلواری شریف، دریاباد اور اعظم گڑھ کے بہت سے علماء وفضلا جمع ہوئے تھے، لیکن عام اجلاس اور نجی مجلسوں میں مولانا ہی بڑے چھوٹے سب کا مرجع بنے ہوئے تھے، اور ہر شخص ان کی باتوں کی مٹھاس اور نرمی سے لطف اندوز ہورہا تھا، موضوع سخن زیادہ تر حضرت سید صاحبؒ ہی کی ذاتِ گرامی تھی، ایک موقع پر فرمایا کہ سید صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ اپنے علم وفضل کے باوجود حضرت تھانویؒ کے آستانے پر جاکر جھک گئے، پھر کہنے لگے کہ اگر دل کی تربیت نہ ہو تو صرف دماغ کو روشن کرکے آدمی نہ خود کوئی نفع حاصل کرسکتا ہے، نہ دوسروں کو پہنچا سکتا ہے جب مجھ کو خبر ملی کہ سید صاحب تھانہ بھون سے منسلک ہوگئے تو میں بے حد مسرور تھا، اور ان کو مبارک باد کے کئی خط لکھے۔

لکھنؤ سے واپسی کے بعد میں نے حضرت سید صاحب کے نام مشاہیر کے جو خطوط دارالمصنفین میں محفوظ ہیں، ان کو دیکھنا شروع کیا، تو ان کے بیعت ہونے کے سلسلہ میں مولانا گیلانی کے بہت سے عجیب وغریب خطوط نظر آئے، مثلاً ایک مکتوب مورخہ ۲۵/ اپریل ۱۹۴۲ء میں کس والہانہ انداز سے تحریر فرماتے ہیں:

"الحمد للہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت وعمل کی نعمت بھی آخر میں آپ کے لیے مقدر تھی، آستانۂ تھانہ بھون کی حاضری کا حال مولانا عبدالباری صاحب سے معلوم ہوتا رہتا تھا، هنيئاً لكم ثم هنيئاً لكم، الصادقين کی معیت آپ کو مبارک ہو، انعمت عليهم کے

صراط کی ہدایت اصل ہدایت ہے، غضب اور ضلالت سے نجات کی واحد راہ یہی ہے، حسن أولئك رفيقا کی سند کے ساتھ الرفيق الأعلى کی مجلس انس کی شرکت ہر قسم کی مجلسوں سے گزرنے کے بعد انشاء اللہ رسوخ تام کی بشارت وضمانت کی حامل ہے، عجب راہ ہے، نہ یہاں محاسدہ ہے، نہ مباغضہ، نہ مناقشہ، نہ مقابلہ، بلکہ ہر ایک دوسرے کے لئے داعی، گو مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں، لیکن اب تک وہ حلاوتیں دلِ ناکام کو یاد ہیں، جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں، آپ لوگوں کی انقلابی زندگی غیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف باعثِ عبرت ہے"۔

اس خط میں مولانا کے آئینۂ دل کا جو ہر نظر آرہا ہے، وہ حضرت سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ راہِ سلوک پر ان سے بہت پہلے گامزن ہوئے اور جس زمانہ میں حضرت سید صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ:

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ

تو مولانا یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ

سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

ان پر یہ حقیقت پہلے آشکارا ہو چکی تھی کہ

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

مکتوب بالا میں ان کے "دلِ ناکام" کی صدا دراصل ان کے "دل کامگار" کی

غمازی کررہی ہے، مگراس کے اظہار میں کیسی حلاوت ہے، وہ اپنی ''صحتِ نفس'' کی خاطر ''مخالفتِ نفس'' کررہے ہیں، وہ لائق غور ہے، اور یہ درجہ سلوک کی کٹھن منزلوں کو طے کرنے کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے، جب حضرت سید صاحبؒ کومولانا تھانوی کے یہاں سے خلافت ملی، تو مولانا ''محاسدہ'' مناقشہ'' اور'' مقابلہ'' سے پاک ہوکر'' تجرید'' کی حالت میں ۳رفروری ۱۹۴۳ء کو لکھتے ہیں:

سیدی الامام! بشری لکم وطوبی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایں قالبِ فرسودہ گراز کوئے تو دور ست

الکلب علی بابك لیلا و نهارا

کچھ عجب حال ہے، جب آپ کی زیارت موجب اجروثواب بنی تو جسے ثواب واجر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہی اس سعادت سے محروم ہے، آپ کہاں سے کہاں پہنچے اور پہنچائے گئے، اور ہم جرس کارواں کی صرف آواز ہی سنتے رہے، مولانا عبدالباری صاحب سے والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا کی جوتفسیر آپ کے ساتھ ہورہی ہے، اس کی خبر سنتا رہتا ہوں، کتنی مسرتیں ان خبروں میں اپنے لیے پاتا ہوں، آپ کو اس کا شاید اندازہ نہ ہوگا، خبر ملی تھی کہ آستانۂ حکیم الامت مدظلہ العالی سے سند خلافت بھی حاصل ہوچکی ہے، معارف کے شذرات میں جو کچھ جس قلم سے شائع ہوئے، اب اس کی عبدیت اور بندگی میں کون شک کرسکتا ہے بندے نے بندے کے بندے ہونے کی توثیق کی، میرے نزدیک تو

خلافت کا حاصل ترجمہ یہی ہے، جب سب کچھ گناہوں سے مٹ جائے اور

از خدا خواہم وز غیرخواہم بخدا

کہ نیم بندۂ غیرونہ خدائے دگراست

اسی ایک حقیقتِ واقعہ کاتحقق تام، بس سب کچھ صرف یہی ہے، ایاك نعبدو إیاك نستعین کے مقام پر سرفرازی نصیب ہوئی، انشاءاللہ فردوس میں اس کی منزل کی تیاری ہے ایسی مہمان نوازی کو لا یبغون عنها حولا اس لیے کہ لو کان البحر مداداً لکمات ربی لنفد البحر، طلب لامحدود کے لیے مطلوب کو بھی لامحدود ہونا چاہئے، بلکہ مطلوب کی لامحدودیت ہی نے اس طالب کو پیدا کیا، جس کی ''بلوغیت'' کسی نقطہ پر ختم نہیں ہوئی، کسی راہ میں ہو، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی فطرت کے اس جذبہ کو اسی راہ پر لگا دیا، جس کے پیدا کرنے والے نے اسے پیدا کیا تھا کہ آدمی نے اس بلوعیت کوخودنہیں پیدا کیا، ورنہ خلف کے فاعل کا مجہول کیوں کیا جاتا، دیکھیے قدم بوسی کی تمنا کب پوری ہوتی ہے اورحالات کیا عرض کروں ۔

ہمیں نالۂ ماندمسکیں حسن را

ازاں روز ترسم کہ ایں ہم نہ ماند

واللہ اعلم نسل انسانی کی دیوار کس کروٹ گرنے والی ہے، خیر ہم تو بہت جی چکے، اتنا کہ حساب سے عہدہ برآ ہونا صرف فضل ہی کے محول ہے، اب تو سامنے زیادہ یہی حال رہتا ہے

عنقریب ست کہ زاما اثرے باقی نیست

شیشہ بشکستہ وے ریختہ وساقی نیست

یہ مکتوب چھپنے کے لیے نہیں لکھا گیا تھا، محض ایک نجی خط ہے، جو قلم برداشتہ لکھا گیا

ہے لیکن اس کے پڑھنے کے بعد دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ یہ تحریر ایک پاک دل اور پاک طینت
ہی انسان کے قلم سے نکل سکتی ہے، اس میں ایسا مسلکانہ ذوق وشوق اور عارفانہ کیف
وبیخودی ہے جو لکھنے والے کے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تحلیۂ روح کا پتا دیتی ہے۔

اور ''گوہر عشق''، ''گوہرِ روح'' اور ''گورہر معرفت'' کے پرکھنے والے جوہری
نے حضرت سید صاحبؒ کو ۲۳/مارچ ۱۹۴۳ء کو پھر ایک نجی مکتوب میں تحریر فرمایا:

''سیدی الکریم، زادکم اللہ عرفاناً وقرباً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقیناً ہم امینوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یونہی بلندی کیا کم تھی اور اب
تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت وخلافت کی دولت سے سرفراز ہیں، چالیس
سال تک مولانا شبلی کی اور عمر عزیز کے چہل سالہ کے بعد مولانا تھانوی کی نیابت کی

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا، خلافت کے زمانے میں لباس کی قیمت
چند درہم سے آگے نہ بڑھی، پوچھنے والے نے ولید اور عبدالملک کی گدی پر بیٹھنے والے سے
پوچھا، مشہور جواب ہے کہ تمنا کی مدینہ کی ولایت کی، پوری ہوئی، فاطمہ بنت عبدالملک سے
شادی کی، پوری ہوئی، خلافت کی، پوری ہوئی، اب جنت کی تمنا کی باری ہے، صرف اس کا
سامان ہے، آپ نے بھی وہی کیا اور خوب کیا، ومثل هذا فليعمل العاملون، بارك الله
فيكم وعليكم''

مولانا کے خطوط سے کیسی وضاحت ہو جاتی ہے کہ حضرت سید صاحب نے کیوں

تھانہ بھون کے آستانہ پر جا کر اپنی جبینِ نیاز رکھ دی تھی۔

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ
مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

جب راقم کا دل مولانا کی روحانی عظمت سے متاثر ہو رہا تھا، ان ہی دنوں ان کا
ایک مضمون ''مسلمانوں کا اندلس مسلمانوں کی نگاہ میں'' معارف میں شائع ہوا، جس کی سطر
سطر سے اسلام کے لیے ایک بے چینی اور تڑپ ظاہر ہوتی ہے، اور ایک عارفانہ بصیرت
سے دکھایا گیا ہے کہ اگر مروانی حکومت اسلام کی تمکین اور استقرار کے لیے قرآنی نصب
العین سامنے رکھتی تو وہ ختم نہ ہوتی، لیکن ان کی حکومت کے زمانے میں قرآن سے چشم پوشی
اختیار کی گئی، قرآنی دعوت کے پیش کرنے والے نمونوں سے اعراض کیا گیا، اور ان لوگوں کو
جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار دینے پر اصرار کرتے تھے، رسوا
اور بدنام کیا، اور ان کے مقابلہ میں مستقل محاذ بنا لیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہی بھڑکائی
ہوئی آگ میں مروانیوں کی حکومت خود ہی جل بھن کر ختم ہوگئی، آخر میں مولانا نے ایک
بہت ہی حکیمانہ بات لکھی ہے کہ ''مسلمانوں کے لیے وہ اندلس زیادہ پائدار ہوتا جس میں
وہ خواہ الحمراء، الزہراء، قرطبہ اور غرناطہ نہ ہوتے مگر مسلمانوں پر جو فرض آخر الامم ہونے کی
حیثیت سے عائد کیا گیا ہے، اگر اس کو وہاں کا حکمراں طبقہ پیش نظر رکھتا تو وہ سیاسی مصائب
وآفات کے جن گردابوں میں تہ وبالا ہو کر رہ گئے، شاید یہ صورت پیش نہ آتی''، مولانا کا یہ
پیام آج بھی تمام اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لیے ہے، یعنی اگر وہ مادی اور نمائشی

کاموں کوانجام دینے کے بجائے مسلمانوں کے اخلاق وکرداراورسیرت کاالحمراءاورقرطبہ بنانے میں مشغول ہوجائیں تو کوئی قوت ان کونہیں مٹاسکتی۔

اس مضمون کو پڑھنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد مجھ کو آگرہ جانے کا اتفاق ہوا اور تاج محل دیکھنے گیا تو اس کی غیر معمولی صناعی، بے مثل کاری گری، اوردل کشی ورعنائی دیکھنے کی ساری لذت مولانا کے مضمون کو یاد کر کے جاتی رہی اور یہی خیال آیا کہ اگر ہندوستان کے مسلم حکمراں شاندار عمارتیں بنانے کے بجائے یہاں کے مسلمانوں کے کردار کا تاج محل اوراخلاق کالال قلعہ بناگئے ہوتے تو آج ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا کے قلب پر حملہ ہوا تھا، اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کرلی، مارچ ۵۴ء میں ان پر اس کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ امید زیست جاتی رہی، لیکن ان کے جاں نثار بھائی مکارم صاحب نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، ان کو گیلانی سے پٹنہ اسپتال لے آئے اور معالجہ میں روپے پانی کی طرح بہائے، وہ پٹنہ ہی میں مقیم تھے کہ میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا، ڈاکٹروں نے ان کو بہت ہی کم بولنے کی اجازت دی تھی، اور مکارم صاحب نے اور بھی زیادہ پابندی عائد کررکھی تھی، لیکن مولانا نے اس ناچیز کو دیکھ کر ساری پابندیاں توڑ دیں، مکارم صاحب روکتے رہے مگر ان کی باتیں چل نکلیں تو پھر کسی کے روکے نہ رکیں، زیادہ تر تفریحی باتیں رہیں، لیکن ان میں بھی ان کی دقت نظر دکھائی دیتی تھی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ذکر آیا، تو فرمانے لگے کہ ان کی طبیعت میں بچپن ہی سے بڑی نکتہ وری تھی، وہ دیوبند میں تعلیم پارہے تھے، تو ان کے کسی ہم درس کی

کتاب غائب ہوگئی، اس نے درس کے وقت مدرس سے شکایت کی کہ کسی لڑکے نے اس کی کتاب چرالی ہے، مدرس صاحب جھلا کر بولے، افسوس ہے کہ دیندار لوگ بھی چور ہوتے ہیں، مولانا اشرف علیؒ اسی وقت بول اٹھے کہ ایسا نہ فرمائیں، بلکہ یہ کہیں کہ ”کوئی چور دیندار لوگوں کے ساتھ پڑھنے آگیا ہے“۔ مولانا گیلانی کو ارادت تو مولانا محمود الحسنؒ سے تھی، لیکن ان کو مولانا تھانویؒ سے بھی بڑی عقیدت تھی، اوران کا ذکر ہمیشہ بہت ہی محبت اوراحترام سے کرتے، وہ اسی وسیع المشربی کی وجہ سے ہر طبقہ میں محبوب رہے، پٹنہ میں ان کے معالج ڈاکٹر عبدالحئی تھے، جو وہاں کے مشہور ومقبول ہونے کے علاوہ بڑے مقبول طبیب ہیں، لیکن وہ مولانا کا علاج بڑی محبت اور تندہی سے کررہے تھے، اوراس کو بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پٹنہ سے گیلانی واپس چلے گئے، اور مکارم صاحب کی نگرانی میں بڑی احتیاط سے زندگی بسر کرنے لگے، ان کو لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کردیا گیا تھا، لیکن وہ حریصانہ نظروں سے اپنی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھا کرتے تھے، شیخ ابن عربی پر لکھنے کے لیے دارالمصنفین سے بہت سی کتابیں منگائی تھیں، ان کو کبھی کبھی الٹ پلٹ کر دیکھ لیتے تھے، مگر مکارم صاحب کی تیکھی نظروں کو دیکھ کر بند کردیتے، گو ہم لوگوں کو جب خطوط لکھتے تو اپنی زندگی کی مایوسی کے باوجود علمی دنیا میں مراجعت کی امیدیں بھی دلاتے، ان کو دنیا میں اگر کوئی حسرت باقی رہ گئی تھی، تو یہی کہ بعض چیزیں جو ان کے سینہ میں ہیں، ان کو سفینہ میں منتقل کرنے سے معذور ہو رہے تھے۔

راقم مئی ۵۶ء میں اعظم گڑھ سے وطن پہنچا تو ان کی قدم بوسی کے لیے گیلانی

پہنچنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک روز ڈاک سے ان کا حسب ذیل محبت نامہ ملا۔

''عزیز محترم ....(۱) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اتنے طویل المدت مریض کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ مرجانے یا تندرست ہوجانے کا فیصلہ قدرتی ہے، لیکن کیا کیجئے، آپ کا یہ مریض المسمی بہ مناظر احسن گیلانی نہ اب تک مرا ہے اور نہ اچھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے، اسی حال میں مگن ہے جس میں رکھا گیا، کل شاہ صاحب (۲) قبلہ کا نوازش نامہ ملا، جس میں آپ کے دیسنہ پہنچنے کی خبر درج تھی، دارالمصنفین کی جو امانت ہمارے پاس محفوظ ہے، اس کو آپ کے حوالہ کر دینا چاہتا ہوں، کیونکہ اب شیخ ابن عربی پر کچھ لکھوں تو ضرورت ہے کہ دوسری دفعہ پیدا کیا جاؤں، اب فرمائیے کہ اس کے لیے کیا کروں؟ کیا دیسنہ ان کتابوں کو کسی کی معرفت بھیجدوں! مگر آپ کی ملاقات سے محرومی معمولی محرومی نہ ہوگی، بہرحال جو رائے عالی (۳) ہو، اس سے مطلع فرمائیں، ڈاک سے اس لیے خط بھیج رہا ہوں کہ زمینداری ختم ہونے کے بعد اب چھٹی چپاتی کی کوئی راہ ڈاک کے سوا باقی نہیں رہی..........''

اس خط کے فوراً ہی بعد میں گیلانی حاضر ہوا تو ان کے چہرہ کو تو منور لیکن جسم کو نحیف، لاغر اور کمزور پایا، اوران کے دونوں پاؤں پر آماس دیکھ کر عجیب کیفیت گذری، مجھ

(۱) مولانا اپنے اخلاص وشفقت میں چھوٹوں کے لیے بھی ایسے القاب لکھ دیتے جن کے وہ مستحق نہ ہوتے، اس لیے کچھ الفاظ حذف کر دئے گئے۔

(۲) جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مراد ہیں۔

(۳) یہ الفاظ ان کے ظرف عالی کا ثبوت ہیں۔

کو دیکھ کر چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے، بڑی محبت اور گرم جوشی سے بغل گیر ہو کر فرمایا: ''خوب آ گئے، اب چل چلاؤ ہے'' یہ سن کر دل پر ایک چوٹ لگی، مکارم صاحب موجود تھے، اس لیے وہ رک رک کر باتیں کرتے رہے، مگر جب مکارم صاحب اٹھ کر چلے گئے، تو گفتگو کا سرچشمہ بہہ نکلا، فرمانے لگے گیلانی بہت عزیز ہے، اس لیے یہیں پڑا ہوں، پھر گیلانی پر اپنی ایک مطبوعہ مثنوی پڑھنے کو دی جس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

مسقط الراس وہ وطن پیارا — عہد طفلی کا اپنے گہوارہ
منظر اس کا ہے کیسا دیدہ زیب — اف وہ مینو سواد زہد فریب
وہ درختوں کی اس کے رعنائی — اور باغوں کی حسن وزیبائی

پھر بڑی احتیاط سے ایک ملفوف خط دے کر کہا ''اسکو پڑھو، میں نے اسی خط کی بنا پر گیلانی نہیں چھوڑا'' میں نے وہ خط لیا تو اس کے اوپر ان ہی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ فقرے تھے۔

''ایک تاریخی مکتوب یعنی نامۂ سلیمانی جس میں گیلانی میں قیام پر اصرار کیا گیا ہے''

میں نے خط کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ حضرت سید صاحب نے ان کو ۱۱رفروری ۱۹۴۷ء میں بھوپال سے حیدرآباد دکن تحریر فرمایا تھا۔

''محبّ اعز واعز، م تعنابیر کاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، میں لوگوں کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتا کہ بہار کے مقتولین وشہدا کا ایسا نقشہ کھینچیں کہ باقی ماندوں پر رعب اور ہراس چھا جائے، ورنہ ایک دن پورا ہندوستان

خالی کرنا پڑے گا، اب آپ بھی گیلانی میں ہیں، اور آئندہ بھی یہیں رہیں گے''۔

ابھی خط پڑھ ہی رہا تھا کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت سید صاحب نے میرے لیے پیشین گوئی کی تھی، بلکہ ان کا حکم تھا، اس لیے میں یہاں پڑا ہوں۔

حضرت سید صاحبؒ سے انکی یہ عقیدت کتنی قابل قدر ہے، پھر وہ ان ہی کے متعلق دیر تک گفتگو کرتے رہے، اور فرمانے لگے، میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۳۰ء میں ہی ان کو مولانا تھانویؒ کے پاس بھیجا تھا، اور جب وہ مولانا سے مل کر واپس آئے تو کچھ خوش نہ تھے، ملاقات کی تفصیل سے اندازہ ہوا کہ اس موقع پر انہوں نے مولانا تھانویؒ سے پورے عالمانہ انداز میں گفتگو کی تھی، میں نے سید صاحب سے عرض کیا آپ کی ناخوشی بے جا نہیں، مولانا تھانویؒ کو آپ تو پسند آئے، لیکن آپ جس مقام سے بول رہے تھے، وہ ان کو پسند نہیں آیا، سید صاحب یہ سن کر پھڑک اٹھے، اسی سلسلہ میں مولانا نے فرمایا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جب حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے پاس پہونچے تو ایک روز حضرت گنج شکرؒ نے ان سے کہا'' آؤ آج تم کو عوارف المعارف پڑھائیں'' حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اس کتاب کو پہلے پڑھ چکے تھے، اور اس پر پوری طرح حاوی تھے، اس لیے ان کو خیال ہوا کہ درس سے ان کے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا، مگر مرشد کا حکم تھا، اس لیے کتاب لے کر پہنچے، درس میں کئی مسئلہ پر حضرت نظام الدینؒ نے بحث کرنے کی کوشش کی، حضرت فریدالدینؒ کتاب بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے، اور کئی روز تک حضرت نظام الدینؒ سے مخاطب نہیں ہوئے، مرشد کی یہ آزردگی دیکھ کر حضرت نظام الدینؒ نے ان سے پوچھا، کیا میں نے درس

میں کوئی غلط بات کہی تھی، حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا نہیں، جو بات کہی تھی وہ تو صحیح تھی، لیکن جس مقام سے تم کہہ رہے تھے وہ صحیح نہ تھا۔

مولانا نے اس واقعہ کو کچھ ایسے موثر انداز میں بیان کیا کہ اس کو سن کر مجھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے تاریکی کے پردے اٹھ گئے، زندگی کو سمجھنے اور سلجھانے میں یہ کتنا اہم نکتہ ہے! راقم خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو کی روانی اور شیرینی سے لذت لیتا رہا، لیکن اسی زمانہ میں اپنے ایک عزیز ڈاکٹر محمد امام سپرنٹنڈنٹ پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال سے وہاں کا ایک واقعہ سنا تھا، جو ان کی خدمت میں عرض کیا، وہ یہ تھا کہ اسپتال کے جنرل وارڈ میں ایک فوجی کپتان کا بچہ داخل ہوا، اس کی ماں تیمارداری میں تھی، جو آس پاس کے مریضوں کو بہت تنگ کرتی تھی، اور اس سے سب ہی پریشان تھے، بغل ہی میں ایک بوڑھا لیکن ظریف مریض بھی تھا، ایک روز فوجی کپتان وہاں آیا، بوڑھے مریض نے اشارے سے اس کو اور اس کی بیوی کو اپنے پاس بلایا، اور اس کی بیوی کو مخاطب کر کے کہا: ''بیٹی! ایک قصہ سنو، ایک شخص کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اس کو اللہ میاں مل گئے، اس نے اللہ میاں سے پوچھا'' آپ نے انسانوں کے کھانے کے لیے تو طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں، لیکن آپ خود کیا کھاتے ہیں؟ اللہ میاں بتانے پر راضی نہ ہوئے، لیکن جب وہ بضد ہوا تو فرمایا: ہم بس ایک ہی چیز کھاتے ہیں، اور وہ انسان کا غرور ہے، یہ قصہ سنا کر بوڑھے مریض نے اس عورت سے کہا کہ بیٹی! کہیں ایسا نہ ہو کہ تو بھی اللہ میاں کی غذا نہ بن جائے''۔

یہ قصہ سن کر مولانا جو لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے، فرمایا کہ کیا خوب قصہ سنایا،

پھر کلام پاک کی آیتیں پڑھ کر سنانے لگے، اوران کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ میاں نے کہا ہے کہ میں نے سب کچھ اپنے بندوں کو دے دیا ہے، اپنے پاس کچھ نہیں رکھا، البتہ کبریائی کی ایک چادر ہے، جس کو اوڑھے رہتا ہوں، اب اگر کوئی بندہ اس کو بھی مجھ سے لینا چاہتا ہے تو میں برہم ہوجاتا ہوں کہ اس کو یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پاس یہ چادر بھی رہے، اس مزاحیہ تفسیر میں گوش شنوا کے لئے کیا کچھ نہیں ہے۔

ان ہی دنوں معارف میں چندر پرکاش جوہرؔ کی ایک غزل شائع ہوئی تھی، سلسلۂ کلام میں مولانا نے پوچھا، یہ کون اہل دل ہیں؟ عرض کیا کہ ابھی بالکل ہی نوجوان ہیں، فرمایا کہ یہ تو کوئی دل ہی والا کہہ سکتا ہے

یہ کمالِ ضبطِ غم ہے کہ سلیقۂ محبت
مرا دل تو رو رہا ہے مگر آنکھ تر نہیں

پھر کہا کہ ظالم نے کیا کہہ دیا ہے

وہ تمام تر توجہ بایں سازش تغافل
وہ یوں باخبر ہیں جیسے انہیں کچھ خبر نہیں

اور پھر بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھا:

غم جستجو کے صدقے وہ مقام دل بھی آیا کہ
بجز خیالِ جاناں کوئی ہم سفر نہیں ہے

شاید وہ اپنے ''مقام دل'' میں اپنے ''ہم سفر'' کو دیکھ رہے تھے سلسلۂ کلام جاری

تھا کہ مکارم صاحب آگئے، اس لیے وہ خاموش ہوگئے، پھر جب مکارم صاحب گاؤں کے قصے سنانے لگے تو مولانا ان کی گفتگو سننے میں محو ہوگئے۔

میرا قیام دن بھر رہا، آموں کا موسم تھا، اس لیے دسترخوان پر آموں کا ڈھیر تھا، خود مولانا نے صرف چند قاشیں کھائیں، لیکن آموں کی رعنائی دیکھ کر اور ان کی تعریف سن کر بہت مسرور نظر آرہے تھے، مکارم صاحب کی گفتگو سننے کے بعد جب کبھی ان کو خود باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ زیادہ تر اپنی موت ہی کا ذکر کرتے، اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ اب ان کے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی، ہاں دکھ تھا تو یہ کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے چاروں طرف کتابیں دیکھتے تھے لیکن پڑھ نہیں سکتے تھے، اور پڑھنے سے زیادہ لکھنے سے معذور ہو چکے تھے، وہ گویا اپنے آپ کو آبِ حیات کے پاس کھڑا دیکھتے لیکن اس کے پینے پر پابندی عائد تھی، ان کے لیے یہ تکلیف ناقابل برداشت تھی جس کو دور کرنے کے لیے کبھی اپنے چھوٹے نواسے انس، کبھی پالتو تیتر اور مور سے دلچسپی لے کر وقت گذارنے کی کوشش کرتے۔

جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو عجب پُر درد منظر تھا، میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا، میں تو اب برابر یہی پڑھتا ہوں:

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبراؤ شاد   جی چکے، بس تا کجے مرجاؤ شادؔ
منہ نہ پھیرو اس نگاہ مست سے   برچھیاں سینہ پہ تن کر کھاؤ شادؔ

اور یہ شعر تو گویا ان کی موت کی پیشین گوئی تھی۔

میں نے مانا بخشوا لوگے گناہ
اور جو اس کی بھی نہ مہلت پاؤ شآد

اس کو پڑھ کر فرمایا، کن کن آرزوؤں کے لیے آدمی زندہ رہے، اور یہ اشعار سن کر تو میں بھی آبدیدہ ہوگیا۔

خطِ شوق اپنا لفافہ میں رکھو — آرزوؤں کو کفن پہناؤ شآد
دے چکی اک عمر تک دنیا فریب — اب نہ اس دھوکے کے اندر آؤ شآد

لیکن وہ خود اس طرح مسرور اور شاداں ہوکر ان اشعار کو پڑھ رہے تھے جیسے اس دارالمحن کو چھوڑ کر ایک ابدی دارالمسرت کی طرف کوچ کے لیے بے چین ہوں۔

جب میں ان سے رخصت ہوا تو یہ خیال کر کے دل بیٹھا جاتا تھا کہ اب شاید ملاقات کی نوبت نہ آئے، اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ حضرت سید صاحبؒ کی رحلت کے بعد کبھی کبھی مولانا کی صحبت میں جو ذہنی سکون اور روحانی لذت مل جاتی تھی، کہیں اس سے بھی محروم نہ ہوجاؤں۔

دیسنہ واپس آنے کے پانچویں ہی روز یعنی ۵/جون ۱۹۵۶ء کو یکا یک خبر ملی کہ مولانا جنت کو سدھار گئے، یہ خبر اتنی دیر میں ملی کہ شرکت جنازہ کی سعادت سے محروم رہا، دوسرے دن علی الصبح گیلانی پہنچا، جب مکارم صاحب نظر آئے تو مجھ کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، وہ مولانا سے صرف چار سال چھوٹے تھے، لیکن اس طرح رو رہے تھے جیسے کوئی بچہ اپنے شفیق باپ کی موت پر روتا ہو، بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے جیسی

محبت کی، اس کی مثال بہت ہی کم ملے گی، وہ رو رو کر بیان کرنے لگے کہ بھائی مرحوم ادھر کئی روز سے بہت اچھے تھے، گذشتہ رات کو اور بھی زیادہ خوش تھے، رات کے گیارہ بجے تک قوالی کی دھن میں کچھ غزلیں پڑھوا کر سنتے اور ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کرتے رہے، بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، ان کو دیر تک نیند نہیں آئی، مگر پھر سوگئے، صبح سویرے اٹھے، وضو کیا کھڑے ہوکر فجر کی نماز ادا کی، وظیفہ پڑھا، پھر پلنگ پر آکر لیٹ گئے، ملازم سے کہا رات نیند کم آئی تھی، اس لیے چادر اڑھا دو، سوؤں گا، سوئے تو ابدی نیند سو گئے، اور جب ہم لوگوں نے سانس رکتے ہوئے دیکھا تو ان کا چہرا جوانوں کی طرح شگفتہ اور شاداب ہوگیا تھا۔

کیسی اچھی موت پائی، ایک پاکیزہ روح اسی طرح عالم بالا میں منتقل ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ جنازے میں آس پاس کے گاؤں کے ہندو مسلمان بکثرت شریک ہوئے تھے، اور اس چھوٹے سے گاؤں میں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، اسی آمد میں مولانا مرحوم کے کچھ کاغذات اور کتابیں دیکھنے کا موقع ملا، ان کو مولانا عبدالماجد دریا آبادی مدظلہ العالی سے بڑا قلبی لگاؤ تھا، ان کی ترجمہ کردہ ''مناجات مقبول'' کی تلاوت روزانہ کرتے، اسی کے ایک ورق پر حسب ذیل تحریر پڑھ کر حیرت ہوئی:

''۱۰/اپریل ۱۹۵۲ء یکا یک سونے کے وقت رات کو قرآنی آیت: اللہ يتوفى الأنفس حين موتها والتي لم تمت في منامها فيمسك التي قضى عليه الموت ويرسل الأخرى إلى أجل مسمى کا خیال آیا، عجب بات ہے کہ آخر میں فرما ہی دیا گیا

إن فی ذلك لآيات لقوم يتفكرون، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور ہوگئی ہیں، حالانکہ اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کردیا گیا ہے کہ نیند جیسے آتی ہے، موت بھی اسی طرح آتی ہے، نیند آنے میں سونے والوں کو تکلیف کب ہوتی ہے، پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے، ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ سکرۃ الموت کے لفظ سے نتیجہ نکالا کرتے تھے کہ عند الموت مرنے والے پر نشہ کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، حضرت تھانوی نے امام غزالی کی ان روایتوں کی تنقید کرائی تھی جن سے موت کے شدائد پر امام نے احیاء العلوم میں استدلال کیا ہے''۔

مولانا نے آیت مذکورہ سے جو استنباط کیا تھا، اسی کے مطابق ان کی موت ہوئی، جو بلاشبہ ایک مومن اور ایک عارف کی موت کہی جاسکتی ہے، انہوں نے شاید چشم بینا سے اپنی موت کا منظر پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

مزار پر حاضری سے پہلے بعض اعزہ کے زنانخانے میں چلا گیا، تو وہاں عورتوں کو سوگوار و اشکبار پایا، اور وہ کہہ رہی تھیں کہ جو بیوائیں ان کے مقرر کیے ماہانہ وظیفے پر زندگی بسر کررہی تھیں، اب ان کے دن کیسے گزریں گے، پھر اس کی تفصیل معلوم ہوئی کہ وہ کس طرح خاموشی سے ناداروں اور غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

جب ان کے مزار کی طرف چلا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فضل و کمال کے خاتمہ پر آنسو بہانے، عالمانہ موشگافی اور نکتہ وری پر ماتم کرنے اور بہار کی علمی عظمت و فضیلت پر فاتحہ پڑھنے جارہا ہوں، اور جب تربت نظر آئی تو بے اختیار آنسو نکل پڑے کہ آہ! ایک منور چہرہ، ایک لطیف جسم، ایک روشن ضمیر، ایک صاف طینت، ایک پاک دل، ایک پیکر محبت اور ایک مخزن علم اس تودۂ

خاک میں دفن ہے، مگر دل یہ کہہ رہا تھا کہ قبول و مغفرت کا تاج ان کے سر پر رکھا جاچکا ہوگا، ان کے محبوب آم کے درختوں کی ہری ہری ڈالیاں ان کی تربت پر سایہ فگن تھیں، میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں سے نقشِ حیرت بنا رہے تھے اور اقبال کا یہ شعر اچھی طرح ذہن نشین ہو رہا تھا

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

اور اقبال نے یہ شعر بھی شاید ان ہی جیسے بزرگوں کے لیے کہا ہے

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اور وہ یقیناً اپنے ''دل الفت نسب''، ''سینۂ توحید فضا''، نگہۂ جلوہ پرست'' اور ''نفس صدق گزیں'' کی وجہ سے ''صاحبِ عشق'' تھے، اور ان کو حیاتِ ابدی حاصل ہے۔

اور جب گیلانی چھوڑ کر واپس جارہا تھا تو ان کے یہ اشعار یاد آرہے تھے:

یاد آتی ہے مجھ کو گیلانی — مظہر لطف غوث سبحانی
مصدر راز ہائے عرفانی — مطلع جلوہ ہائے روحانی
منبع علم مخزنِ حکمت — مرکز جاہ و عظمت و شوکت

گیلانی کی سرزمین میں ان کے آسودۂ خاک ہونے سے یہ اشعار کس قدر بامعنی اور صحیح ہوگئے۔